# کائنات

ثریا جبیں قادری

# کائنات

از

**ثریّا جبیں قادری**

ناشر

اُردو کونسل ہند

دارالغیاث، اردو گلی، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

# پیش لفظ

میں ثریا جبیں قادری آپ سے مخاطب ہوں۔ میں اپنے والدین کی منجھلی لڑکی ہوں۔ میری بنیادی تعلیم مولوی کے ذریعہ گھر پر ہوئی تھی۔ جب سات برس کی ہوئی تو میرا نام بتیا ہاؤس ہائی اسکول میں لکھوا دیا گیا۔

موتی ہاری مہارانی جانکی کنور اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ بھاگل پور گرلس کالج میں ایڈمیشن لیا۔ پانچ ماہ کے بعد مجھے مونگیر کالج میں ٹی۔ بی لے کر پھر ایڈمیشن لینا پڑا کیونکہ والد کا تبادلہ مونگیر ہوگیا تھا۔ مونگیر کالج سے آئی۔ اے۔ کا امتحان دیا۔ میں نے پرنسپل اردو بھی اپنے سبجیکٹ میں رکھا تھا۔ سچیتا نند سنہا اور سنت کمار سنہا ہمارا اردو کا کلاس لیتے تھے۔ سچیتا نند سنہا عالم فاضل تھے۔ سنت کمار سنہا اردو پڑھاتے تھے۔ شعر اور افسانہ لکھنے کا طریقہ بتاتے تھے۔

موتیہاری میں ماسٹر، رؤوف مجھے ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ وہ بھی تھوڑی بہت اصلاح کر دیا کرتے تھے۔ وہ جمیل مظہری کے زیر اثر تھے۔ میں کچھ نہ کچھ لکھ کر ''بانو'' پرچہ میں بھیجتی تھی جو اکثر چھپ جاتا تھا۔ ''صنم'' پرچہ پٹنہ سے نکلتا تھا، اس میں میرا لکھا ہوا ایک افسانہ ''ہم سفر'' لوگوں کو پسند آیا تھا۔ جب بھی موقع ملتا، میں کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی تھی۔ کتابیں پڑھنا میرے معمول میں شامل تھا اور آج بھی ہے۔

میں نے بی۔ اے میں داخلہ تو لیا تھا لیکن ۱۹۶۱ء میں شادی ہوگئی تو پڑھائی کا سلسلہ ختم ہوگیا اور اس کے بعد سلسلے وار لکھنا اب میرے لئے ممکن نہیں رہا۔

# اتحادِ ملّت

میرا جہاں میرا چمن میرا وطن ہندوستاں
اس کی مٹی میں مِلے ہیں میرے پُرکھوں کے نشاں

ملتے جلتے ہیں یہاں شادی بیاہ کے سب رسوم
کھانا پینا ایک ہے اور رہنا سہنا ایک ہے

کوئی مذہب یہ نہیں کہتا کہ آپس میں لڑو
تو سنا گیتا کی وانی، ہم سنائیں گے قرآں

ہے یہ گوتم کا نگر، نانک کی یہ ہے سرزمیں
منّتیں ہوتی ہیں پوری چشتیؒ کے دربار میں

کاشی مَتھورا اور بنارس ہند کی پہچان ہیں
مندریں اور مسجدیں دونوں یہاں کی شان ہیں

لال پتھر کا قلعہ اکبر نے بنوایا یہاں
شہ جہاں نے تاج کو جنت سے لا کے رکھ دیا

دھوکے سے آیا فرنگی شاہ کو دھوکہ دیا
بیش قیمت سب نگینے لوٹ کر وہ لے گیا

پورے دو سو سال تک اس ملک کو لوٹا کیا
جانے سے پہلے دلوں میں ایک کانٹا بو گیا

گاندھی کی للکار پر ہندو مسلماں جُٹ گئے
جان کی قربانیاں دے کر نکالا دیش سے

پر دمِ آزادی، یاں پر ایک جھگڑا ہو گیا
کس کی ہوگی سلطنت اور کون ہوگا حکمراں

دشمنی اتنی بڑھی کہ فیصلہ کرنا پڑا
بٹ گیا ہندوستاں اور پاک پیدا ہوگیا

ہو چکیں باتیں جبیںؔ، اب ہند کی پہچان کی
پھر سناؤں گی کہانی بڑھتے ہندوستان کی

مختصر سا تذکرہ ہے ملک یہ جنت نشاں
میرا جہاں میرا چمن میرا وطن ہندوستاں

# برہا

بادل کالا کالی رات سجنی کے لمبے کالے بال
گورا چندا گوری چندنیا گورے ہیں سجنی کے گال

نینا برسے، جیرا ترسے کویلیا جب کرے پکار
بندی چوڑی، لہنگا چنّی، سب ہو گئے بے تال

باٹ نہاریں بوجھل پلکیں جب کھٹ کھٹ کرے کواڑ
دن بیتا، اب سانجھ بھئی، بن ساجن، سنجی بے حال

پایل کی چھَن چھَن چپ ہوگئی اب بولے ہے پہریدار
اماں نے آواز لگائی سوجا دُلہن ہوگئی رات

رونا دھونا بند کر دُلہن کل آئے گا ترا گوپال
آئی ہے چٹھی سرحد سے جیت گیا ہے میرا لال

❁

# شکایت

میری محفل میں شب و روز تم آیا نہ کرو
میری توقیر کے کلمات سنایا نہ کرو

چال جو تم نے چلی اس کو میں پہچان گئی
اَوروں کا نام لے کے، خود کو بچایا نہ کرو

تو ہے نادان تجھے کیسے بتاؤں ہمدم !
میری رُسوائی کا سامان جٹایا نہ کرو

تہمتیں خوب گڑھیں مجھ کو ستانے کے لئے
میرے رستے میں کبھی بھول کے آیا نہ کرو

ایک رشتہ تھا کبھی جس کو نبھایا میں نے
اس وسیلے سے بھی اب مجھ کو بلایا نہ کرو

میں تو اب غیر ہوں غیروں سے رفاقت کیسی
اپنی بیکار دلیلوں کو سنایا نہ کرو

تم جو برباد ہوئے، میں نے بھی تو زخم سہے
اب جبیںؔ کو بھی قرار آگیا، آیا نہ کرو

# ایک خواب

جنگلوں کا سلسلہ تھا، شام کی پرچھائیاں
راستے دشوار تھے، درمیاں تھی کھائیاں

اک ندی پیشِ نظر تھی دُور تک پھیلی ہوئی
جارہی تھی ایک کشتی نرم رَو بہتی ہوئی

ناگہاں میری نظر کشتی میں اماں پر پڑی
میں بہت گھبرا گئی تو زور سے چلّا پڑی

دیکھتے ہی دیکھتے پھر کھو گئی کشتی کہیں
نیلے امبر پر ستارے چاند کُہرے میں کہیں

غور سے دیکھا تو پھر اماں نظر آئیں وہیں
روتے روتے آہیں بھرتے گر گئی میں بھی وہیں

اپنی ہی آواز سے جب آنکھ میری کھل گئی
سب اقارب رو رہے تھے، میں بھی پھر رونے لگی

اُٹھ رہا تھا اب جنازہ ہوش میں آئی جبیںؔ
معاف کرنا مجھ کو اماں میں یہاں تھی ہی نہیں

# آسان نہیں ہے

ہر کام کو ہوجانا بھی آسان نہیں ہے
ہر چیز کا پا لینا بھی آسان نہیں ہے

ساحل پہ نظر اپنی ہے طوفان کا ڈر ہے
کشتی کا چلا پانا بھی آسان نہیں ہے

رقصاں ہیں میرے دل میں تمنائیں شب و روز
قسمت کا بدل پانا بھی آسان نہیں ہے

باہر جو چلے جاتے ہیں کچھ لوگ وطن سے
خود اپنا ٹھکانہ بھی تو آسان نہیں ہے

غم ہو کہ خوشی ہو کہ جبیںؔ، ترکِ تعلق
آنکھوں کا بچا پانا بھی آسان نہیں ہے

بیشک گھروں سے لوگ نکلتے ہیں شب و روز
گھر چھوڑ کے جانا بھی تو آسان نہیں ہے

گرمی کی تپش یا کہ ہو برسات کا عالم
جاڑے کا زمانہ بھی تو آسان نہیں ہے

یادیں ہیں کہ جاتی ہی نہیں دِل سے ہمارے
سب کچھ تو بھلا پانا بھی آسان نہیں ہے

# ایک سوال

بھارت کے نوجوانو، ہندوستاں کے باسی
میرے سوال کا تم دل سے جواب دینا
تم کیوں بھٹک رہے ہو بدنام راستوں پر
تم کیوں جھگڑ رہے ہو اپنے ہی بھائیوں سے

ہندو نہیں ہے کوئی، مسلم نہیں ہے کوئی
سب ہیں خدا کے بندے، انسانیت دھرم ہے
آدم کے تم ہو بیٹے، حوّا کی بیٹیاں ہیں
بدنام ہو رہا ہے، اب ملک یہ ہمارا

پیسے دکھا کے کوئی بہکا رہا ہے تم کو
کُھلوا رہا ہے تم سے کسی بینک کی تجوری
کٹوا رہا ہے تم سے کسی بے گناہ کی گردن
ماؤں کی گودیوں کو کروا رہا ہے سونی

بہنوں کی آبرو کو لُٹوا رہا ہے کوئی
شرمندگی کا پانی، آنکھوں میں مر گیا ہے
چوری چماری کرکے تم نے جو دھن کمایا
اِترا رہے ہو ایسے، جیسے کہ بادشاہ ہو !

اُترن کی جینس پہنی، چوری کی شرٹ جھاڑی
گوگلس لگا کے اب تم بننے چلے ہو ہیرو

نوٹوں کی گڈّیاں ہیں، جیبوں میں ہیں تمنچے
ملنے چلے ہو پھر تم، بدنام ساتھیوں سے

رچنے چلے ہو پھر تم، اِک لوٹ کی پلاننگ
پکڑے گئے اگر تم، تب جیل میں پٹوگے
مارے گئے اگر تم، کسی کھیت میں سڑوگے
نفرت کریں گے تم سے، اپنے بیگانے سب ہی

نا تو کفن ملے گا، نا ہی ہوَن ملے گا
کیوں شکتیوں کو اپنی برباد کررہے ہو
محنت کی روزی لاؤ، محنت کی روٹی کھاؤ
پہلے بُرا لگے گا، پھر سب بھلا لگے گا

امّاں کے آنسو پوچھو، بابا کے پاؤں چھو لو
امّاں دعائیں دیں گی، اللہ مدد کرے گا
بھارت کے نوجوانو! انسان بن کے دیکھو
جب ڈر نہ کوئی ہوگا، کتنا سکوں ملے گا

انسانیت میں مُکتی، انسانیت دھرَم ہے
انسانیت سے بڑھ کر کوئی نہیں کرَم ہے
سن کر جبیؔں کی باتیں اب تم بُھلا نہ دینا
میرے سوال کا تم، دل سے جواب دینا

❁

# ضِد کا انجام

نازک سی ایک کلی تھی، پھولوں میں وہ پلی تھی
ابو کی تھی دُلاری، امی کی لاڈلی تھی

سب کی دعائیں لے کر پروان وہ چڑھی تھی
ہر فن میں تھی مہارت، سولہ برس کی وہ تھی

بولی تھی پیاری پیاری، ہنستی ہوئی ادا تھی
چہرے کا رنگ شہابی، جیسے کہ اَپسرا تھی

حسن و جمال کی اِک بارش سی ہو رہی تھی
اسکول ختم کرکے، کالج میں آگئی تھی

پاپا کو شوق تھا کہ افسر بنے گی بیٹی
امّی جھگڑ رہی تھیں، بعد عقد وہ پڑھے گی

پھوپھی بھی چاہتی تھیں اپنی بہو بنانا
آنے لگے تھے رشتے، ایسے بہو کی چاہ تھی

رشتے بہت سے آئے، اچھے بھلے تھے لڑکے
سب نے اسے سراہا، ہر کو بہت پسند تھی

پڑھنا ہے اس کو آگے، پاپا نے کہہ کے روکا
کیا عمر ہے ابھی تو، بیٹی مری پڑھے گی

وہ پڑھتی جارہی تھی، سِن بڑھتا جارہا تھا
اٹھائیس پار کرکے، اب تیس ہو رہی تھی

جو بن اُڑا اُڑا تھا، دل میں اَگن کی بارش
خاموش ہوگئی تھی، بیمار پڑ رہی تھی

اب چاہ کے بھی اچھے، ملتے نہیں تھے لڑکے
رشتے جو پہلے آئے، سب گھر بسا چکے تھے

پاپا کو اپنی ضِد کا احساس ہورہا تھا
بیٹی خوشی کی خاطر قربان ہو چکی تھی

افسوس ہے جبیںؔ کو ماں باپ کی سمجھ پر
جو راہ چل رہے ہیں، مذہب سے اپنے ہٹ کر

اس کتاب میں جو غزلیں اور نظمیں میں نے لکھی ہیں، براہِ کرم ملاحظہ فرما کر آپ کچھ افسانے بھی پڑھیں۔

ان غزلوں اور نظموں میں مَیں نے وہی لکھا ہے جنہیں میں محسوس کرتی ہوں۔ میرے دل کے تأثرات مجھے یہ سب لکھ دینے پر مجبور کرتے ہیں۔

میرا ارادہ کسی کو تکلیف پہنچانے کا ہرگز نہیں ہے۔ جو دل سے آواز اُٹھتی ہے، میں اسے قلم بند کر لیتی ہوں۔

اب بات ہے کہانیوں کی، ان کے کچھ نہ کچھ واقعات تو سچائی کا عکس لئے ہوئے ہیں مگر کردار زیادہ تر خیالی ہیں۔ اس لئے براہِ کرم کوئی مجھ سے یہ نہ کہے کہ میری زندگی کا خاکہ آپ نے کیوں لکھ ڈالا۔

میں اس کتاب کی اشاعت کے لئے اللہ رب العزت کا سب سے پہلے شکریہ ادا کرتی ہوں جس نے مجھے اپنے خیالات و جذبات کو کتابی شکل دینے کی توفیق عطا کی۔ میں اپنے بیٹے عزیزم کوکب قادری کو اس سلسلے میں دعائیں دیتی ہوں جس نے میری اس کتاب کی اشاعت میں مدد کی ہے۔ میں ''اردو کونسل ہند'' کی بھی شکرگزار ہوں جس نے اردو دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے میری اس کتاب کی اشاعت کو شرفِ قبولیت بخشی۔

''کائنات'' کے سلسلے میں مجھے آپ کے تاثرات کا شدّت سے انتظار رہے گا۔

ثریا جبیں قادری
علی نگر انیس آباد،
پٹنہ۔۸۰۰۰۰۲ (بہار)

# گیت

بابُل موہے ڈولیا چڑھائیں نیہر چھوٹا جائے
سکھی ری مورا جیرا اُڑا اُڑا جائے

جب سے میں سسرار پدھاری، میکہ کی یاد ستائے
سکھی ری مورا جیرا اُڑا اُڑا جائے

میگھا گرجے بجری چمکے، من مورا گھبرائے
سکھی ری مورا جیرا اُڑا اُڑا جائے

کاہے کہوں میں مَن کی بتیاں کچھ نا موہے سومائے
سکھی ری مورا جیرا اُڑا اُڑا جائے

بھیگی موری دھانی چُنریا انچرا لپٹا جائے
سکھی ری مورا جیرا اُڑا اُڑا جائے

ٹپکے بوندیاں ہوئی میں بوریا کجرا بہتا جائے
سکھی ری مورا جیرا اُڑا اُڑا جائے

پتیاں لکھ لکھ تو ہے میں ہاری ساجن اَبھو نہ آئے
سکھی ری مورا جیرا اُڑا اُڑا جائے

# مغرور ہو گئے

ایک بار جیت کیا ملی، مغرور ہو گئے
اب ہارنے کے بعد تو وہ چور ہو گئے

بے وجہ دشمنی کا نتیجہ ہے سامنے
پینسٹھ برس کی عمر میں بچے سے لڑ گئے

ہر بار تم نے راہ میں کانٹے بچھا دیئے
سمجھا نہیں تھا اپنا تو ناکام ہو گئے

ساری خدائی ہاتھ میں لے کر چلے تو تھے
اتنا غرور ہو گیا، بدنام ہو گئے

سب جانتے ہیں تم نے کیا کیا نہیں کیا
جمہور کو ہی اپنا سپاہی سمجھ گئے

اپنی برادری کا تو بھرتے رہے ہو دم
ضد اپنی پوری کرتے رہے اور بہک گئے

ٹوٹا ہے دل تمہارا تو کیسا لگا تمہیں
دِل اُن کا کئی بار تو تم بھی دُکھا گئے

سمجھانے پر بھی تم نے نہ مانی ہماری بات
ساتھی بنا کے اس کو تو گُم نام ہوگئے

لوٹا ہے اُس نے پہلے بھی اَوروں کو بار بار
تم تو نئے تھے جال میں پھنستے چلے گئے

پیسے لٹائے خوب اُسی نامراد پر
سوچا تھا تم نے اب تو ہم گلفام ہوگئے

دادا کی وراثت پہ تو اِترا رہے تھے تم
اب آگیا رِزلٹ تو شرما کے رہ گئے

کہتی ہے جبیںؔ تم سے کہ چپ چاپ ہی رہو
اِس کو ٹکٹ ملے کہ اُس کو ٹکٹ ملے

❁

# غلط فہمی

اب ان کو مجھ سے ملنے کی فرصت نہیں ملتی
پہلے کی طرح تم میں مروّت نہیں ملتی

مشغول اتنے ہوگئے کہ دُور ہوگئے
شاید انہیں بیگم سے اجازت نہیں ملتی

تعریف میری جب سنی ان کو بُری لگی
یہ بات گر نہ ہوتی نفرت نہیں ملتی

ان کو بھی خبر ہے کہ تم کون ہو مرے
ضد ہوگئی ہے اتنی کہ اُلفت نہیں ملتی

اب جب بھی کبھی آنا ہو تو ساتھ ہی آنا
تم ساتھ ہی آتے تو عداوت نہیں ملتی

تم یہ بھی سمجھتے ہو کہ نادان بہت ہیں
بتلا کے اگر آتے تو ذلّت نہیں ملتی

روٹھی ہوئی ہیں وہ تو انہیں جلد منا لو
میکے جو چلی جائیں گی ماما نہیں ملتی

تکرار میرے نام پہ کرنا فضول ہے
اچھی طرح سے ان کو وضاحت نہیں ملتی

سمجھو کہ جبیؔں آپا، مری کوئی نہیں ہیں
آپا تو بہت ملتی ہیں، بیوی نہیں ملتی

# موسمِ سرما

جاڑے کا زمانہ بھی کیا خوب زمانہ ہے
ٹھنڈک کی شکایت ہے، سونے کا بہانہ ہے

سردی کا ہے یہ موسم تیّاریاں کرنی ہیں
ہر چیز سکھانا ہے جاڑے کا زمانہ ہے

روزانہ نئے کھانے قابوں میں پلیٹوں میں
ہر ذائقہ ہے دونا جاڑے کا زمانہ ہے

تفریح میں جانا ہو تقریب میں جانا ہو
ہر وقت مناسب ہے جاڑے کا زمانہ ہے

جب چاہو نکل جاؤ سورج کے مزے لے لو
موسم یہ سُہانا ہے، جاڑے کا زمانہ ہے

شالوں کو لبادوں کو لپٹائے ہوئے رکھو
خود ہوگی پریشانی، جاڑے کا زمانہ ہے

ہلکی ہیں ہوائیں گر کب رُخ ہی بدل جائے
شام ہونے کو آئی ہے، جاڑے کا زمانہ ہے

بوڑھوں کو بزرگوں کو آرام بہت دینا
گرما کے انہیں رکھنا، جاڑے کا زمانہ ہے

قسمت سے ہی ملتا ہے خدمت کا کوئی موقع
چھوٹوں کو بتانا ہے، جاڑے کا زمانہ ہے

سہنا ہے جبیںؔ سب کو موسم کا ستم لیکن
خدمت میں ہی عظمت ہے، جاڑے کا زمانہ ہے

مانگے سے بھی ملتی نہیں سوغات دعاؤں کی
نکلے گی دعا دل سے، جاڑے کا زمانہ ہے

❁

# بسنت بہار

پھوٹی شفق تو رات کے ماتھے پہ پسینہ
شبنم گری تو پھول کے ہونٹوں پہ نگینہ
چمکی کرن تو سب کو نئی زندگی ملی
بال اپنے سکھانے کو بیٹھی ہے حسینہ
لہراتی ہوئی سرسوں ہے، اِٹھلاتی ہوائیں
موسم نے لٹا ڈالا ہے یہ چمپئی خزینہ
کلیوں کی بسنتی پر بھوروں کی بھنک ہے
قدرت نے سکھایا ہے جینے کا قرینہ
یہ آم کے منجر، یہ کُسم، کوئلوں کی کوک
چپکے سے کھسکنے لگا سردی کا زمانہ
ڈالیں ہیں کہ سیمل کی کونپل سے لدی ہیں
ملنے لگا پھولوں کو کھلنے کا بہانہ
ہولی ابھی آئی نہیں سجنے لگے گلال
لو آ گیا پلٹ کے پھر پھاگن کا مہینہ
ہے ہند کا تہوار یہ، رنگین فسانہ
بھیگی نظر آئیں گی شاہیں اور کرینہ

# شیطان بہت ہیں

اس شہر میں سب لوگ ہی حیران بہت ہیں
انسانیت شرمندہ ہے، شیطان بہت ہیں

محنت کی کمائی کو لے اُڑتے ہیں ظالم
چالاکیاں کرتے ہیں، بے ایمان بہت ہیں

باتوں میں وہ اُلجھاتے ہیں، انسان کو اپنی
رکھتے ہیں عقل ہم بھی، پہ نادان بہت ہیں

ناحق کی کمائی ہے، غربت کا ہے رونا
ذہنوں میں حسد، دل سے پریشان بہت ہیں

ہر ایک سے شکوہ ہے دُہراتے ہیں اکثر
اپنی ہی خرافات سے، انجان بہت ہیں

ہم جانتے ہیں ان کے فتوری دماغ کو
بحثوں میں لڑے جانے کے، امکان بہت ہیں

کرتے نہیں قدرت کی عنایت کا شکر وہ
ہر چیز فنا ہونی ہے، نقصان بہت ہیں

ڈرتی ہے جبیںؔ اپنے گناہوں کی سزا سے
اُس خالقِ مطلق کے تو، احسان بہت ہیں

❁

# مختصر تعارف

| | | |
|---|---|---|
| نام | : | ثریا جبیں قادری |
| والد کا نام | : | ڈاکٹر سید عزیز الحسن رضوی (ڈپٹی ڈائرکٹر ایگریکلچر) Ph.D |
| والدہ کا نام | : | سیدہ قمر النساء بیگم |
| تاریخ پیدائش | : | ۸/اپریل ۱۹۴۱ء |
| جائے پیدائش | : | محسن پور، نالندہ (بہار شریف) |
| ابتدائی تعلیم | : | مولوی سید اظہر، حبیب ماسٹر وغیرہ |
| اسکول | : | بتیا ہاؤس ہائی اسکول، جمالپور |
| میٹرک | : | مہارانی جانکی کنور ہائی اسکول، موتیہاری |
| آئی-اے | : | مونگیر ویمنس کالج، مونگیر |
| تاریخ شادی | : | ۷/مئی ۱۹۶۱ء |
| شوہر کا نام | : | ابرار احمد قادری مرحوم |
| اولاد | : | کوکب قادری، نغمہ حسن، غنچہ احمد |
| پسندیدہ مشغلے | : | لکھنا، پڑھنا، گھر کی دیکھ بھال، سینا پرونا، مہمانوں سے ملنا، تقریبات میں شرکت کر کے لطف اندوز ہونا، وغیرہ وغیرہ۔ |

# سزا جھیل رہے ہیں

ناکردہ گناہوں کی سزا جھیل رہے ہیں
ہم اپنی وفاؤں کی سزا جھیل رہے ہیں

شانہ بہ شانہ ہم بھی تو تھے ساتھ تمہارے
قربانیوں کی اپنی سزا جھیل رہے ہیں

اس گھر کو سنوارا تھا بڑے شوق سے ہم نے
اب اپنی ہی محنت کی سزا جھیل رہے ہیں

دیتے نہیں صلہ ہمیں حقدار بنا کر
ہم ان کے تعصُّب کی سزا جھیل رہے ہیں

کام ہم بھی تو کرتے ہیں جبیںؔ جان لگا کر
کوتاہ نگاہی کی سزا جھیل رہے ہیں

ترکش جو چلاتے ہیں وہ آنکھوں میں چھپو کر
ایک آہ نکلتی ہے مگر جھیل رہے ہیں

خاموشی تو ہم ہیں مگر کمزور نہیں ہیں
ہم اپنی شرافت کی سزا جھیل رہے ہیں

درگاہ پہ چادر تو اُٹھا لیتے ہیں سر پر
ہم ان کی عقیدت کی سزا جھیل رہے ہیں

ہم اپنی ہی قدروں پہ جبیں چلتے رہیں گے
وہ خود ہی پشیماں ہیں سزا جھیل رہے ہیں

# کوشش

میں کچھ کرکے دیکھنا چاہتی ہوں
خودی کو آزمانا چاہتی ہوں

تخیُّل میں نہاں ہے جو بھی خاکہ
حقیقت میں بدلنا چاہتی ہوں

کوئی تو ہو میری غزلوں کو پرکھے
ادب کے پھول چُننا چاہتی ہوں

شکایت ہے نہ شکوہ کی صدا ہے
دلوں میں گھر بسانا چاہتی ہوں

سبق محنت کا جب سے پڑھ لیا ہے
جبیںؔ خود پر بھروسہ چاہتی ہوں

یہ رستے ہیں کہ ٹیلے پتھروں کے
ملے منزل تو چلنا چاہتی ہوں

ابھی تو ہوں سفر میں، مُدّعا ہے
ستاروں تک پہنچنا چاہتی ہوں

❁

# میرا گھر کہاں ہے

جو گذر گئی وہ تھی زندگی
کبھی تھی بہار رواں دواں
کہ برس رہی تھی یہیں چاندنی
دبی آگ اب ہے، دھواں دھواں

میری کیفیت تو نہ پوچھ اب
ملا درد مجھ کو جدا جدا
کوئی نامہ بر مجھے ڈھونڈھتا
میرا نام لے کے صدا صدا

ہے غبار اب مرے نام پر
کہ حرف کا رنگ مِٹا مِٹا
جہاں نام دل پہ کھدا رہا
جبیں دوست تجھ پہ فدا فدا

کوئی در نہیں میرا گھر کہاں
وہ حقیر خاک پر گرا گرا
مرے صبر کو تو نہ آزما
ہے لحد میں میرا مکاں مکاں

تجھے کیا سناؤں میں داستاں
شب و روز ہے اب خزاں خزاں

❁

# صبح کا خواب

سَحَر کا سماں تھا سہانا سہانا
تھا صحنِ گلستاں سلونا سلونا

پلنگ تھا بچھا سبزہ زاروں کے اوپر
حسیں بیل بوٹے نگینہ نگینہ
میں لیٹی تھی تکیہ لگائے پلنگ پر
کتاب ہاتھ میں تھی صحیفہ صحیفہ

جو آہٹ سنی تو نظر اُٹھ گئی تھی
نگاہوں میں اُلفت خموشاں خموشاں
مرے سامنے تھا کھڑا میرا ہمدم
وہی اس کا چہرہ فروزاں فروزاں

حسیں پیڑ سے پھول توڑے تھے اس نے
چمیلی کھلی تھی قرینہ قرینہ
لباسِ نفاست سبک پیرہن تھا
جھلک آنکھ میں تھی شبینہ شبینہ

دئے تھے مرے ہاتھ میں پھول اس نے
جبیں ہو رہی تھی پسینہ پسینہ
کھلی آنکھ دل میں سکوں، چشم تر تھا
میں بعد اس کے روئی ، کبھی نہ کبھی نہ

# چاندنی رات

آؤ بیٹھو ذرا چاندنی رات ہے
چاند کے سامنے چاند کی بات ہے
آؤ بیٹھو ذرا چاندنی رات ہے

کوئی چھپ کے رہا، دیکھ کر ہنس رہا
غم نہ کر مسکرا چاندنی رات ہے
آؤ بیٹھو ذرا چاندنی رات ہے

ہے فلک پر ستاروں کا اِک قافلہ
سرد ہے اب فضا، چاندنی رات ہے
آؤ بیٹھو ذرا چاندنی رات ہے

پانچ تارے مِلے تو ثریّا بنی
ٹھنڈا ٹھنڈا سماں چاندنی رات ہے
آؤ بیٹھو ذرا چاندنی رات ہے

ہے جبیں پہ ستاروں کی ضو پاشیاں
کوئی ہے نغمہ سرا، چاندنی رات ہے
آؤ بیٹھو ذرا چاندنی رات ہے

جوہی بیلے کے غنچے بھی کھلنے لگے
مہکی مہکی ہوا، چاندنی رات ہے
آؤ بیٹھو ذرا چاندنی رات ہے

جگنوؤں کی چمک ڈالیوں کی لچک
خوش ہیں ارض و سما، چاندنی رات ہے
آؤ بیٹھو ذرا، چاندنی رات ہے

صبح ہونے کو ہے رات جانے کو ہے
عرش پر نورِ کوکب چمکنے کو ہے
آؤ بیٹھو ذرا چاندنی رات ہے

چاند کے سامنے چاند کی بات ہے
آؤ بیٹھو ذرا چاندنی رات ہے

# گلاب

بُوٹے میں شاندار ہے پودا گلاب کا
پھولوں میں لاجواب ہے غنچہ گلاب کا

ہوتی ہے قسم اس کی ہزاروں کے آس پاس
بہتر سبھی میں رنگ گلابی گلاب کا

غنچہ کھلا تو پھول بنی پتّیاں جبیںؔ
شبنم کو پی کے کِھل گیا پتّہ گلاب کا

جاڑے کی ہلکی دھوپ میں نکھرا ہوا ہے رنگ
پیتا ہے پانی کم، یہ ہے پودا گلاب کا

ڈالی پہ اس کے خار کے پہرے پڑے ہوئے
آساں نہیں ہے ہاتھ لگانا گلاب کا

نورِ جہاں کے غسل کی زینت تھی اس کی بو،
اُٹھتا تھا گرم پانی میں بھبکا گلاب کا

تحفہ گلاب کا ہے محبت کی علامت
مہکا جبیںؔ کے صحن میں گملا گلاب کا

❁

# غزلیں

# خودنوشت

# غزل

دشمنی ہو، دوستی ہو، اعتدال باقی رہے
راہ بر ہو، رہ گذر ہو، اعتدال باقی رہے

لینا دینا خرچ کرنا بھی ضروری کام ہے
مفلسی ہو یا امیری، اعتدال باقی رہے

ہم نشیں ہو، ہم سفر ہو، گفتگو ہوتی رہے
راز افشا ہو نہ پائے اعتدال باقی رہے

یوں تو آنگن کی دیواریں ہیں بہت اُونچی مگر
ہولے سے اُن کو بُلانا، اعتدال باقی رہے

کُھل کر ہر اِک بات کہہ دی تو بُرا لگ جائے گا
سب بتا کر کچھ چھپانا، اعتدال باقی رہے

جا رہی ہے اب جبیںؔ آرام کرنے کے لئے
بے مزہ موسم بھی ہے تو اعتدال باقی رہے

❁

# غزل

دل پہ ہوتا ہے اثر جب، تو غزل ہوتی ہے
کئی لمحات جو گزرے تو غزل ہوتی ہے

تیری آہٹ سے میرے دل میں سویرا جاگے
مسکراتی ہوئی آئی تو غزل ہوتی ہے

دھڑکنیں تیز ہوئیں جانِ تمنا بن کر
زلف اُلجھی ہوئی سُلجھے، تو غزل ہوتی ہے

پھول کا رنگ نگاہوں میں سنور جاتا ہے
ٹھہریں گلشن میں کہیں پر تو غزل ہوتی ہے

جھیل کی موج خرامی اور جبیں کے نغمے
سامنے بیٹھ کے سُن لیں تو غزل ہوتی ہے

بھیگی پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو لے کر
درد میں ڈوب کر نکلے تو غزل ہوتی ہے

شمع جل جل کے پگھل جائے بھری محفل میں
کوئی ہوتا ہے فدا جل کے، تو غزل ہوتی ہے

# غزل

کرتا ہے حسد مجھ سے کوئی میری بلا سے
جلتے ہیں مری شاعری سے میری بلا سے

لکھنے کی صفت دی مجھے پروردگار نے
اصلاح لینی چاہئے تھی، میری بلا سے

ہمت ہے تو آ بیٹھ مرے سامنے آکر
چھپ چھپ کے کیا سنتا ہے غزل، میری بلا سے

لوگوں نے مجھے شاعرہ اب تک نہیں مانا
جو کچھ انہیں کہنا ہے کہیں، میری بلا سے

جلنے کی جو عادت ہے تو یہ شوق ہے تیرا
بے وجہ بحث کرتا ہے، کر، میری بلا سے

لکھتی ہوں ثریا میں غزل، ذہنِ رسا سے
مانے یا نہ مانے تُو سہی، میری بلا سے

# غزل

میری غزل کو اپنی بتا کر چھپا دیا
شرمندگی نے ان کو معمہ بنا دیا

پوچھا کسی نے رستے میں کیا حال ہے جناب
جھنجھلا کے اُن کو ایک طمانچہ جما دیا

اب حال یہ ہے محفلوں سے بھاگتے ہیں وہ
گر کیوں؟ کسی نے پوچھ لیا دل جلا دیا

ڈر ہے مقدمہ نہ کہیں ٹھونک دے جبیںؔ
اس فکر نے اُنہیں تو تماشہ بنا دیا

❁ تمام شد ❁

# KAAENAAT

ثریا جبیں قادری

ناشر

اردو کونسل ہند

دارالغیاث، اردو گلی، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

# یادیں بچپن کی

(۱)

بچپن بے فکری کا وہ دَور ہوتا ہے جس میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں بہت پیاری لگتی ہیں۔ کھیلنا، کودنا، گڑیوں کا بیاہ رچانا، سہیلیوں کے ساتھ باتیں کرنا، کبھی روٹھ جانا پھر مل جانا، ذرا سی بات پر رُو دینا اور ذرا سی خوشی پر ہنس دینا، یہ ہر بچے کی فطرت ہوتی ہے۔ عقل کم، اس لئے شرارتیں بھی کم وبیش ہوتی رہتی ہیں۔

بہت سی یادوں کے درمیان کچھ ایسی یادیں بھی ہوتی ہیں جو زندگی بھر ذہن سے چپکی رہتی ہیں۔ انہیں یادوں میں سے میں نے بھی اپنے احساسات کا ذکر کیا ہے۔ ہمارے پاس ایک جیپ تھی۔ ہینڈل گھمانے پر کافی آواز دیتی تھی، اس کے بعد ہی چلنا شروع کرتی تھی۔ ہمیں جب کسی خاص جگہ جانا ہوتا تھا تو بڑی کوفت ہوتی تھی۔ بڑوں کے بارے میں تو مَیں نہیں کہہ سکتی لیکن ہم بچوں کو جانے کی جلدی رہتی تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ جیسے ہی ہم گاڑی پر بیٹھیں، یہ رفتار پکڑ لے۔

ایک دن سنا کہ ایک کار خریدی جائے گی جس میں نہ زیادہ آواز ہوگی، نہ ہینڈل سے چلے گی۔ بس بیٹھو اور کار چل پڑے گی۔ یہ سب سن کر میں بہت خوش ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ جلدی سے کار آجاتی تو ہم لوگ خوب گھومتے۔

پھر ایک دن ابا جان، چچا اور شبراتی ڈرائیور کار لانے کولکاتہ چلے گئے۔ سنا کہ ایک ہفتہ بعد کار آئے گی۔ میرے لئے دن کاٹنا دوبھر ہوگیا۔ امی سے پوچھتی کہ

اب اور کتنا دن باقی ہے۔ میں کار کے آنے کا انتظار بڑی بے صبری سے کر رہی تھی کہ ایک دن شام کو جب ہم لوگ چھت پر کھیل رہے تھے، کسی نے کار کے آجانے کی خبر دی۔ جیسے ہی میں نے سنا، خوشی کے مارے بُرا حال تھا۔ کھیل چھوڑ کر دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی کار کو دیکھنے نیچے آ پہنچی۔ مَیرون رنگ کی گاڑی ہمارے کمپاؤنڈ میں کھڑی تھی۔ گھر کے سب لوگ کار کا معائنہ کر رہے تھے۔ ہر شخص اپنی رائے دے رہا تھا اور کار کو چھو کر بھی دیکھ رہا تھا۔

میں اور گھر کے دوسرے بچے بھی کار کے اندر بیٹھنے کو بے چین تھے۔ ابا جان نے کہا کہ ابھی گاڑی صاف ہو جائے گی، تب تم لوگ گھوم لینا۔ دیکھ نہیں رہی ہو کہ راستے میں کتنی گرد پڑی ہے۔ ڈرائیور کو نہا دھو لینے دو، پھر ہم لوگ گھومنے چلیں گے۔ اس شام تو ہم گاڑی پر کہیں نہیں جا پائے، لیکن دوسرے دن ہمیں گھما پھرا دیا گیا۔ ہماری بے چینی دُور ہو گئی تھی اور ہماری کار پر گھومنے کی وہ للک بھی ختم ہو گئی تھی جس کے لئے میں سب سے زیادہ بے قرار تھی۔ اب سوچتی ہوں تو خود پر ہنسی آتی ہے۔

(۲)

بچپن کی یادیں جو مجھ سے جُڑی ہوئی ہیں، ان میں ایک واقعہ یہ ہے کہ میں مولوی صاحب سے عم سیپارہ پڑھ رہی تھی۔ بھیا قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ وہ اِدھر اُدھر کچھ دیکھنے لگے، تبھی مولوی صاحب کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے کونے میں کھڑی دادا جان کی چھڑی بھیا کو مارنے کے لئے لانے کو کہا۔ میں نے چھڑی نہیں لائی تو انہوں نے میرے کان پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ میں چکرا کر گر گئی۔ کان سے خون بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر بھیا نے دوڑ کر امی جان کو خبر کی۔ سب مجھے اُٹھا کر گھر کے اندر لے گئے۔ امی جان نے دروازہ پر جا کر مولوی صاحب کو خوب ڈانٹا۔ مولوی

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

صاحب سٹپٹا گئے۔

جب ابا جان آفس سے آئے تو انہوں نے مجھے لیٹے ہوئے دیکھا۔ میرا کان پھول گیا تھا۔ دریافت کرنے پر گھر کے لوگوں نے مولوی صاحب کے تھپڑ مارنے کے بارے میں بتایا۔ ابا جان اسی وقت باہر گئے اور مولوی صاحب کا حساب کر دیا۔ نوکر سے اپنے سامنے ان کا بستر لپٹوایا اور ان کو گھر سے نکل جانے کا حکم صادر کر دیا۔

(۳)

بچپن میں مَیں گانا سننے اور گانا گانے کی شوقین تھی۔ اکثر لاؤڈ اسپیکر بجتا تھا اور ریڈیو پر بھی گانا سنتی تھی۔ مجھے فلم برسات، محل اور انارکلی وغیرہ کے گانے بہت اچھے لگتے تھے۔ ایک بار ارشد کاکوی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے گانا سنانے کو کہا تو میں نے کہا کہ میرے کان میں درد ہے۔ انہوں نے کہا کہ کان میں درد ہے تو کیا ہوا، تم تو منہ سے گاؤ گی۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ منہ سے گانے پر کیا کان پر زور نہیں پڑے گا۔ یہ سن کر میری امی جان اور چھوٹے چچا ہنسنے لگے۔ ارشد بھائی لاجواب ہو گئے، کہنے لگے کہ اس لڑکی نے تو مجھے ہی بیوقوف بنا دیا۔ جب وہ بیمار ہو کر ہسپتال میں بھرتی تھے، تب بھی انہوں نے اس بات کو دُہرایا تھا اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

وہ تو بچپن کی بات تھی، اب میں بڑی ہو گئی تھی لیکن آج بھی انکی کہی ہوئی باتوں کا خیال آتا ہے تو میرے دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔ دو دن بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

(۴)

بچپن کی یادوں میں وہ حادثہ بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں بتیا ہاؤس اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ اس وقت کلاس-1 کی ٹیچرز بیدو استانی تھیں۔ سنیچر کے دن

ٹفن سے پہلے ڈرائنگ کا کلاس ہوتا تھا۔ ہمیں کاپی پر پھول، پتے، گڑیا اور مکان وغیرہ بنانے کے لئے دیا جاتا تھا۔ میں نے بھی بورڈ پر سے آم کے پتے کی ڈیزائن اپنی کاپی پر اُتار کر رکھا تھا۔ دوسرے دن ڈرائنگ کی ٹیچر کو دکھانا تھا۔ ٹیفن کی گھنٹی کے بعد جب میں نے اپنا بیگ کھولا تو اس میں میری کاپی نہیں تھی۔ میں رونے لگی تو میری دو سہیلیاں پروفیسر عسکری کی لڑکی رضیہ اور ایک مسلم پنجابی لڑکی روشن نے مجھ سے رونے کی وجہ پوچھی۔ میں نے اپنی کاپی کے گم ہو جانے کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے کہا کہ جب تم لوگ کھیل رہی تھیں تو ہم نے زینب کے ہاتھ میں ایک کاپی دیکھی تھی، اب پتہ نہیں وہ کس کی کاپی تھی۔ انہیں لوگوں نے یہ بات کلاس ٹیچر زبیدہ بانو کو بتا دی۔ ٹیچر نے زینب کو بلا کر اس کا بیگ کھلوایا۔ بیگ سے میری کاپی برآمد ہو گئی۔ ٹیچر نے زینب کے گال پر ایک طمانچہ رسید کر دیا اور آئندہ ایسی حرکت نہ کرنے کی ہدایت دی۔

اس کے بعد میں اور میری دونوں سہیلیاں زینب سے دور رہنے لگیں۔ ہم تینوں لڑکیاں کلاس ٹیچر کے قریب ایک نیچے بینچ پر بیٹھتی تھیں۔ ہمارے لکھنے پڑھنے کیلئے ایک اونچا بینچ لگا رہتا تھا۔ ہم تینوں لڑکیوں کی عمر کلاس کی بقیہ لڑکیوں سے کم تھی۔ ٹیچر کی توجہ ہماری طرف زیادہ رہتی تھی۔ یہ سب دیکھ کر زینب ہم تینوں سے چڑھنے لگی تھی۔

ایک دن ٹیچر سے چھٹی لے کر میں باہر نکلی۔ ابھی جا ہی رہی تھی کہ میرے پیچھے زینب بھی آ گئی۔ جب میں نالے کو تڑپ کر پار کرنا چاہ رہی تھی، تو زینب نے مجھے دھکا دے دیا، میں نالے میں گر گئی۔ نالہ پکا تھا اور اس میں پانی صرف برسات کا ہی بہتا تھا۔ کاغذ کے ٹکڑے اور گھاس پھوس پڑے رہتے تھے۔ اتفاق سے ایک شیشہ کا ٹکڑا بھی تھا جو میری گردن میں لگ گیا۔ میری چیخ سن کر کلاسوں سے ٹیچرس اور لڑکیاں باہر آ گئیں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نالے سے کیسے نکلی۔ مرہم پٹی کے بعد مجھے

ایک ہفتہ آرام کرنے کے لئے گھر بھیج دیا گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد جب میں اسکول گئی تو زینب کو نہیں دیکھا۔ پوچھنے پر میری سہیلیوں نے بتایا کہ پرنسپل صاحبہ نے اس کو اسکول سے نکال دیا ہے۔ اس وقت ایک انگریز لیڈی مسز جون پرنسپل تھیں۔

(۵)

یادوں کا سلسلہ شروع ہوا تو باتیں خود ہی ذہن کے دریچوں سے ٹکرانے لگیں۔ گرمی کی چھٹیاں شروع ہوگئی تھیں۔ میرے چچا ابن الحسن رضوی کی پوسٹنگ ہزاری باغ میں تھی۔

میں، میری بڑی بہن نوشابہ اور ایک رشتہ دار نانی اصغری ہزاری باغ گئے تھے۔ چچا اپنی کار سے اکثر ہمیں گھمانے لے جایا کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیں کینری پہاڑی بھی دکھایا تھا۔ وہاں چڑیوں کے بڑے پیارے گھونسلے ہوتے تھے۔ جب چڑیوں کے بچے بڑے ہوجاتے تھے تو گھونسلے زمین پر پڑے ملتے تھے۔ باسکٹ کی طرح کا ایک گھونسلہ مَیں گھر لے آئی تھی۔

ایک دن سب کا ارادہ پکنک منانے کا ہوا۔ دو تین دن بعد ہم لوگ سویرے ہی گھر سے نکل پڑے۔ ٹانگر فال تک جانے میں ہمیں ایک گھنٹہ لگا۔ ابھی جھرنے سے دور ہی تھے کہ پانی کے گرنے کی تیز آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ وہاں پہنچ کر ہم نے کھانے کا سامان اور اپنے کپڑے نکال لئے۔ کار چچا نے ایک طرف کھڑی کردی اور ہم جھرنوں کے قریب جا پہنچے۔ پانی کے ہزاروں جھرنے پہاڑوں سے نکل کر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر سے اُچھلتے ہوئے بہتے جارہے تھے۔ میں نے ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لئے بڑی خوشی محسوس کررہی تھی۔ سب لوگ پتھروں کی آڑ میں نہانے لگے۔ پانی کی دھار بڑی تیز تھی۔ کچھ دوری پر نانی اصغری بھی نہانے بیٹھ

© جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ


| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | کائنات |
| نام مصنفہ | : | ثریا جبیں قادری |
| سنہ اشاعت | : | ۲۰۱۱ء |
| تعداد | : | ۵۰۰ |
| صفحات | : | ۱۳۶ |
| قیمت | : | ۵۰ روپے |
| ناشر | : | اردو کونسل ہند، دارالغیاث، سبزی باغ، پٹنہ۔۴ |


## ملنے کے پتے


- ''ثریا ویلا''، B/8، علی نگر، انیس آباد، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۲
- اردو کونسل ہند، دارالغیاث، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

رابطہ نمبر: 0612-2251187, 09430248782O

گئیں۔ نزدیک ہی میری خالہ زاد بہن شکیلہ باجی بھی تھیں۔

اتفاق سے نانی اپنا توازن کھو بیٹھیں اور پھسل کر دو پہاڑیوں کے درمیان پھنس گئیں۔ گول مٹول نانی کو شکیلہ باجی نے نکالنے کی کوشش کی تو وہ اور کھسکنے لگیں۔ یہ دیکھ کر شکیلہ باجی زور زور سے سب کو آواز دینے لگیں۔ پانی کی تیز آواز ہونے کی وجہ سے ان کی آواز دب جاتی تھی۔ تب انہوں نے ہاتھ ہلا کر سب کو متوجہ کیا۔ چچا جان نے موقع کی نزاکت کو سمجھ لیا۔ وہ اپنے نوکر کے ساتھ تیزی سے وہاں پہنچے۔ ان دونوں نے نانی کو کھینچ کر باہر نکالا۔ ان کی کمر چھل گئی تھی۔ شکر تھا کہ وہ بچ گئیں اور ایک حادثہ ہوتے ہوتے ٹل گیا۔

(۶)

جب ہماری دادی اماں کا انتقال ہوا تھا تو میں اور میری چچازاد بہن شمیمہ چھوٹی تھیں۔ چالیسواں ہوا تو بڑے بڑے دیگوں میں پلاؤ زردہ بنا تھا۔ پان کا بھی خاصہ انتظام تھا۔ بہت سے لوگ آئے تھے۔ سب لوگ مہمان نوازی میں مشغول تھے۔ ایسے میں شمیمہ اور میں نے بیسیوں بیڑے اُڑا لئے۔ پلنگ کے نیچے چھپ کر خوب پان چبائے۔ جب جی بھر گیا تو باہر نکل آئے۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا لیکن ہماری زبانیں چھل گئی تھیں۔

کئی دنوں تک ہم سے کھانا نہیں کھایا جا رہا تھا۔ دادی اماں کی خدمت گار (بوا دادی) ہمیں تسلی دے کر کہتی تھیں کہ بابو زیادہ غم مت کرو۔ سب کے دادا دادی دنیا سے جاتے ہیں۔ بوا بے چاری کو کیا معلوم کہ دادی جان کے غم میں نہیں ہم اپنی زبانوں کے غم میں مبتلا تھے۔

❁

کے باغوں کا تذکرہ کرتی ہوں۔

## چشمۂ شاہی

اس باغ کو شاہی باغ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بادشاہ شاہجہاں نے اپنے دورِ حکومت میں، مغل گورنر مردان علی کی نگرانی میں بنوایا تھا۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک ٹھنڈے پانی کا چشمہ بڑی روانی سے بہتا ہے۔ اس کا پانی میٹھا اور ہاضمہ کے لئے بے حد مفید ہے۔

## شالیمار باغ

اس کو بادشاہ جہانگیر نے بیگم نور جہاں سے ملاقات کرنے کی غرض سے بنوایا تھا۔ یہاں بھی خوبصورت فوارے اور چشمے سجائے گئے ہیں۔ اس باغ میں پھل پھول کے پودے اور درختوں کی قطاریں سیلانیوں کے دلوں میں اُتر جاتی ہیں۔

## نشاط باغ

نشاط باغ کو ملکہ نور جہاں کے بھائی آصف خان نے بنوایا تھا۔ اس کی بناوٹ سیڑھی نما ہے۔ پتھر کی منقش چوکیوں اور سیڑھیوں کا سلسلہ بہت اوپر تک پہاڑوں پر چلا جاتا ہے۔ چوکیوں کے سامنے سے نکلتے جالی دار جھرنے آبشاروں سے نکل کر بڑے زوروں سے بہتے ہیں۔ باغ کے بیچ میں پانی کا ایک چشمہ ہے جس میں بے شمار فوارے لگے ہوئے ہیں۔ یہ کشمیر کا سب سے بڑا باغ ہے۔

## حضرت بَل

یہ مسجد ڈل جھیل کے پچھمی کنارے پر شہر سے ۹ کیلومیٹر کی دوری پر ہے۔

یہاں سے ڈل جھیل اور پہاڑوں کا نظارہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ یہ مسجد پوری کی پوری سنگ مرمر سے بنی ہے۔ مسجد بہت بڑی اور بہت ہی خوبصورت ہے۔ اس میں صاف ستھرے میدان، درختوں کے ہرے بھرے سائے ہیں۔ جھیل میں اُترنے کے لئے چوڑی چوڑی سیڑھیاں بڑی صفائی سے بنائی گئی ہیں۔ یہاں حضور ﷺ کا موئے مبارک شیشے کے بکس میں محفوظ ہے۔

سون مرگ اور گل مرگ جانے کے لئے پہاڑوں پر گولائی میں راستے بنائے گئے ہیں، جو سیلانیوں کو کار سے اوپر تک لے جاتے ہیں۔ گھوڑوں کی سواری اور لکڑی کی گاڑیاں بھی چڑھائی پر کھینچی جاتی ہیں۔ یہ راستے بڑے ہی خطرناک لگتے ہیں۔ لیکن گھومنے والے ماہر رہبروں کے ساتھ اونچائیوں پر پہنچ ہی جاتے ہیں۔ سون مرگ کے پہاڑ برف سے ڈھکے ہوتے ہیں۔ ان میں سے نکلتے ہزاروں چشمے پتھریلی ندیوں پر گر کر بہتے ہیں۔ پانی کا رنگ کہیں نیلا اور کہیں انگوری نظر آتا ہے۔

سری نگر سے پچاس کیلومیٹر کی دوری پر گل مرگ ہے۔ یہ سیر گاہ خاص ہے۔ اس کی پہاڑیاں نومبر سے جنوری تک بھاری برف سے ڈھک جاتی ہیں۔ سون مرگ ایک خوبصورت سنہری چراگاہ ہے۔ یہاں جانے پر سندھ ندی اور بہت سی جھیلیں راستے میں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں اونتی پور کے کھنڈر، امرناتھ کے مندر اور ویشنو دیوی مندر وغیرہ بھی ہیں۔

کشمیر کے پہاڑوں اور ندیوں کی خوبصورتی لفظوں میں بیان کر دینا مشکل ہے۔ گل مرگ کے اوپر ہرے مخملی میدان اور اس میں کھلتے لال پیلے پھول، برفیلے پہاڑوں سے گھری وادیاں، ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں کہیں جنت ہے تو یہیں ہے۔

کشمیر کی آب و ہوا ٹھنڈی ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ خوبصورت ہوتے

ہیں۔ان کا رنگ گورا اور چہرہ گلابی رنگ لئے ہوتا ہے۔ یہاں مرد اور عورتیں کشمیری لباس پہنتی ہیں۔ قبائلی عورتیں چاندی کے زیورات پہنے ہوتی ہیں جو قیمتی پتھروں سے مزین ہوتے ہیں۔

## کشمیر کی دوکانیں اور بازار

کشمیر میں بہت سی دکانیں تو ہاؤس بوٹوں میں ہی ہوتی ہیں۔اس کے علاوہ یہاں کے بازاروں میں بنی بینت کی چیزوں سے دکانیں بھری پڑی ہیں۔ایک سے بڑھ کر ایک صوفے، کرسیاں اور بہت سی چیزیں بکتی ہیں۔ یہاں لکڑی کی نقاشی کا بہت سامان بکتا ہے۔آخروٹ کی لکڑیوں سے جالی دار ٹیبل، ٹرے اور ہاتھی، گھوڑے سجاوٹ کے لئے بنائے جاتے ہیں۔

ہوٹلوں کی چھتیں، دیواریں اور سیڑھیوں کی ریلنگ بھی خوبصورت صنعت کاری کا لاجواب نمونہ نظر آتی ہیں۔ سیڑھیوں پر بھی خاص اہتمام سے قالین بچھی ہوتی ہیں۔ بازاروں میں مٹی کے ظروف پر باریک پھول پتیاں پکّے رنگوں سے بنی دکھائی دیتی ہیں۔شال اور دوشالوں کی بھرمار ہے۔ سیاحوں سے خوب کمائی ہوتی ہے۔ان سے زیادہ سے زیادہ پیسے وصولے جاتے ہیں۔رہی بات دوسری چیزوں کی، وہ زیادہ تر دلّی اور اس کے آس پاس کے شہروں کی ہی ہوتی ہیں۔ بڑی بڑی دکانیں ہیں اور جو چیزیں ہیں، ان کی قیمتیں آسمان کو چھوتی ہیں۔

دلّی میں زیادہ تر پھل اور میوے وہیں سے آتے ہیں۔ کشمیر میں چیری میوے اور سیبوں کے درخت بڑی تعداد میں ہوتے ہیں۔تاجران درختوں کو ہی خرید لیتے ہیں اور پھلوں کو دوسرے شہروں میں لے جا کر فروخت کرتے ہیں۔

علامہ اقبالؔ نے اپنی کتاب (بانگ درا) میں اپنے وطن، کشمیر کی خوبصورتی

اوراس کے لازوال حسن کی صحیح عکاسی کی ہے۔ ملک سے بے پناہ اُلفت اوراس کی پہچان کا ذکر وہ اپنی نظموں میں بخوبی کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اپنے وطن پر غیروں کی بُری نظر کا اندازہ بہت پہلے ہوگیا تھا کیونکہ ان کا یہ شعراس بات کو بخوبی ظاہر کرتا ہے ؎

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

وغیرہ وغیرہ۔

واقعی ایسا ہی لگتا ہے کیونکہ کشمیر کے پربتوں پر آج فوجوں کے پہرے ہیں۔ چوبیس گھنٹے کشمیریوں اور سیاحوں کی حفاظت حکومتِ ہند کرتی ہے۔ ہر دس قدم پر چوکس سپاہی اپنی بندوقیں تانے کھڑے رہتے ہیں۔ جتنے بھی پہاڑ ہیں، سب پر فوج کی ٹکڑیاں تعینات ہیں۔ شہر میں بھی پولس کی گاڑیاں دوڑتی رہتی ہیں۔ مغلیہ حکومت کے دَور میں بھی جو قلعے بنائے گئے تھے، ان پر بھی پہریدار کھڑے رہتے ہیں۔ مسجدوں پر بھی فوجوں کی تعیناتی ہے۔ کشمیری مہمان نواز اور ملنسار ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان کے دلوں میں کوئی ڈر ہے جو انہیں کھل کر جینے نہیں دیتا۔ پھر بھی وہ وطن سے بہت محبت کرتے ہیں اوراس پر قربان ہوجانے کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔

ایک ہفتہ کشمیر اور ایک ہفتہ دلّی میں رہ کر میں ۳۱/اکتوبر کو پٹنہ اپنے گھر آگئی اوراب میں اُس خوش کن سفر کو لکھ کر اس کی یاد کو تازہ کر رہی ہوں جس کی دل فریبی کا ذکر میں نے مندرجہ بالا سطور میں کیا ہے۔

کشمیر کی وادیوں اوران کی دل کشی کا بیان میں نے اپنی غزل ''وادیٔ کشمیر'' میں کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں :

# وادیٔ کشمیر

لفظوں میں گلستاں کے نظارے بیاں کروں
یا لکھ کے ان کے نازنیں لالے بیاں کروں

وادی تھی کوہ سار تھا کیا کیا چھپا ہوا
اس بے پناہ حُسن پر یہ دل فدا ہوا

میووں سے لد کے جھومتی ڈالی کا وہ جمال
ملتی نہیں جہان میں ایسی کوئی مثال

برفیلی چوٹیوں پہ یہ گرتی ہوئی کِرن
چاندی میں جیسے ڈھل گیا پتھر کا تن بدن

عشق و جنوں میں ہوش کہاں آبشار کو
تھی بے قراری ملنے کی ندیوں کی دھار کو

چلتے ہوئے سفینے پہ مانجھی یہ زندگی
قدرت نے بخش دی ہے فضاؤں کو تازگی

سرشار زندگی ہے یہ جنت نما مقام
جھیلم ندی ہے حُسن کی زیبائشوں کا نام

آبادیوں سے دُور چناروں کے سائباں
وہ سُم کی ٹھپ ٹھپا ہٹیں گھوڑوں کے کارواں

آئی جو رات جھومتی روشن نشاں کے ساتھ
جل اُٹھے سب چراغ رُخِ مہہ وشاں کے ساتھ

# افسانے
# کہانیاں

# دوسری عورت

سامنے کے فلیٹ میں ایک نئے پڑوسی آکر رہنے لگے تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ شری پریم جی ہیں اور ان کی شری متی جی کا نام کانتی ہے۔ چھوٹی سی کالونی میں ایک لان تھا، جس میں فرصت کے اوقات میں کالونی کی عورتیں آکر جاڑے کی دھوپ سینکتی تھیں یا پھر گرمی کے دنوں میں شام کو آکر بیٹھ جاتی تھیں۔ ہر طرح کی باتیں ہوتی تھیں اور دل بہل جاتا تھا۔

ایک دن ان لوگوں نے کانتی جی سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ شری متی کانتی کی عمر چالیس کے قریب ہوگی۔ جب کالونی کے سارے مرد اپنی اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے تو سائرہ، ہِنا، سنگیتا اور نینا، کانتی دیدی سے ملنے گئیں۔ کانتی بہت تپاک سے سب سے ملیں اور سب کے بارے میں پوچھا، پھر اپنے بارے میں بتایا۔ کہا کہ ہماری کوئی سنتان نہیں ہے، ہم دونوں اکیلے ہیں لیکن ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ دُکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔ پریم جی مجھے اتنا چاہتے ہیں کہ کبھی سنتان نہ ہونے کا احساس تک ہونے نہیں دیتے۔ میں کبھی اس بات کو لے کر اُداس بھی ہو جاتی ہوں تو پریم جی میرے ساتھ ہی بہت خوش رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زیادہ مت سوچو، خوش رہو، جس طرح میں خوش رہتا ہوں۔ سب ایشور کے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ جو بھی کرتے ہیں، بھلے کے لئے ہی کرتے ہیں۔

ان باتوں کو سن کر سبھوں نے پریم جی کی تعریف کی اور چائے پینے کے بعد سب گھر آ گئیں۔ دوسرے دن کانتی دیدی سب سے ملنے آئیں۔ باتوں ہی باتوں

میں انہوں نے کہا کہ پریم جی بڑے اچھے آدمی ہیں۔ قریب قریب روز ہی کچھ نہ کچھ لاتے رہتے ہیں۔ میرے منع کرنے پر بھی نہیں مانتے۔ اب دیکھو نا، یہ چوڑیاں لے کر آ گئے۔ انہوں نے اپنی کلائی دکھاتے ہوئے کہا۔ سبھوں نے ان کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی چوڑیاں دیکھیں تو اپنے بارے میں سوچنے لگیں کہ کاش ہمارے پتی بھی ہمیں روز نہیں تو کبھی کبھار ہی کچھ لا کر دیتے۔ جب سب اپنے اپنے گھر چلی گئیں اور ان کے پتی کام پر سے واپس آ گئے تو سب نے اپنے اپنے خاوند سے پریم جی کی خوب تعریفیں کیں۔ کسی نے سنا، کسی نے کہا کہ اب بس بھی کرو۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔

دو روز بعد جب کانتی دیدی سے ان لوگوں کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے پھر پریم جی کی تعریفیں کرنی شروع کر دیں۔ سب نے سنا اور اپنا اپنا دل مسوس کر رہ گئیں۔ پھر تو روز ہی ایسے قصے سننے کو ملنے لگے۔ شری متی کانتی کبھی نئی ساڑی دکھاتیں، کبھی نئی چپلیں دکھاتیں، کبھی سب کو مٹھائیاں کھلاتیں اور یہ بھی کہتی جاتیں کہ پریم جی میرے لئے لاتے رہتے ہیں۔ بھلا اتنا سارا میں اکیلی کیسے کھالوں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے سائرہ اور نینا کو مٹھائی کھلا رہی تھیں اور حنا اور سنگیتا کو مخاطب کر کے بولتی جاتی تھیں کہ تم لوگوں کے پتی کیا کیا لاتے ہیں؟ ان لوگوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ ہمارے پتی تو گھر کے خرچ کا ہی رونا روتے رہتے ہیں، وہ ہمیں کیا دیں گے۔ بس کبھی کبھار کپڑے لتے کے لئے بازار لے گئے یا مہینہ کے خرچ میں سے ہم نے کچھ بچا لیا۔ کانتی دیدی پھر شروع ہو جاتیں۔ نہیں بھئی، میرے پتی تو مجھے بہت چاہتے ہیں۔ اب دیکھو نا، کل ہی دیر سے آئے تو میں ناراض ہوگئی۔ اب کیا بتاؤں پھولوں کا گجرا لے کر آئے تھے۔ اب ایسے میں کوئی کیسے اور کب تک ناراض رہے۔

روز روز اس طرح کی باتیں سن سن کر سب عورتیں اپنے اپنے مردوں سے خوب لڑتیں۔ کچھ مرد تو ہنس کر ٹال دیتے اور کچھ جھلا اُٹھتے۔ شری متی کانتی کو اس کالونی میں آئے ایک سال ہو چلا تھا، وہ اکثر پریم جی کے ساتھ ہفتہ دس دن کے لئے سسرال اور میکے ہو آتیں۔ وہ میکے کی تعریف تو کرتی ہی تھیں، اپنے سسرال کی بھی خوب بڑائیاں کرتیں۔

جب وہ ایک بار سسرال اور میکہ سے گھوم کر آئیں تو حنا نے پوچھا کہ دیدی آپ کی ساس تو آپ کو بہت مانتی ہوں گی؟ انہوں نے کہا ہاں جی، وہ تو دیوی ہیں۔ اتنے میں نینا پوچھ بیٹھی، اور آپ کی نندیں؟ ارے ان کے بارے میں کیا بتاؤں، میرے دونوں دیور اور تینوں نندیں تو ہیرے موتی ہیں۔ ان کی باتیں اتنی لچھے دار ہوتی تھیں کہ کسی کا دل انہیں چھوڑنے کو چاہتا ہی نہیں تھا۔ وہ سب اپنی ساسوں اور نندوں کے بارے میں سوچنے لگ جاتیں۔ جب کبھی کانتی جی نہیں آتیں تو یہ سب ان سے ملنے ان کے فلیٹ میں ضرور جاتیں۔

ایک دن کانتی جی نے خبر سنائی کہ میں پھر گاؤں جا رہی ہوں۔ میرے دیور کی شادی ہونے والی ہے۔ سنگیتا نے پوچھا، کتنے دن بعد آئیں گی دیدی! کانتی جی نے کہا کہ پندرہ دن تو لگ ہی جائیں گے۔ آخر دیور کی شادی جو ہے۔ چنانچہ دو دنوں بعد کانتی جی سب سے مل کر پریم جی کے ساتھ دیور کی شادی میں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد کالونی جیسے سونی ہوگئی۔ اس بار کسی کا دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ بچے بھی کانتی انٹی کی راہ دیکھ رہے تھے کیونکہ اکثر وہ بچوں کو اپنے دومنزلہ فلیٹ کی چھت پر کھیلنے کے لئے بلا لیا کرتی تھیں۔ پریم جی بھی بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے اور وہ دونوں بچوں کو ٹافی چاکلیٹ بھی دیتے تھے۔

# انتساب

اپنے مرحوم رفیقِ زندگی کے نام
جن کی یادیں
آج بھی میرے دل و دماغ میں
تازہ بہ تازہ ہیں
اور
جنہیں میں ہمیشہ تازہ رکھنا چاہتی ہوں

تم کیا گئے کہ سارے نظارے بدل گئے
محفل میں جو بھی لوگ تھے سارے بدل گئے

جب پندرہ دنوں کے بعد پریم جی اکیلے آئے تو بچوں نے آنٹی کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ بعد میں آئیں گی۔ دیکھتے دیکھتے ڈیڑھ مہینہ گزر گیا لیکن پریم جی، کانتی جی کو لانے نہیں گئے۔ کسی کو ان سے کچھ پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا کیونکہ پریم جی سویرے ہی گھر سے نکل جاتے تھے اور رات میں کب آتے تھے، کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ اتوار کے دن بچوں نے انہیں گھیر لیا اور پوچھنے لگے۔ بتایئے نا انکل! آنٹی کو لانے کب جائیں گے۔ نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے بچوں کو جھڑک دیا اور کہا کہ نہیں آئیں گی انٹی ونٹی، جاؤ اپنا کام کرو۔ بچے آنکھیں ملتے ہوئے گھر آ گئے اور اپنی ماؤں سے یہ بات بتائی۔ پریم جی کا یہ رویہ سب کو عجیب لگا۔ سائرہ، سنگیتا، نینا اور حنا فکر مند تھیں۔ انہوں نے اپنے پتیوں سے بھی پریم جی کے اس رویے کا ذکر کیا۔ وہ کیا کہتے، انہوں نے کہا کہ کانتی جی ان کی بیوی ہیں، وہ جانیں، تم لوگوں کو اتنی فکر کیوں ہے؟

ایک دن شام کو بچے لان میں کھیل رہے تھے۔ تبھی انہوں نے پریم جی کی چھت پر ایک عورت کی جھلک دیکھی۔ بچوں نے سمجھا کہ کانتی آنٹی آ گئی ہیں۔ وہ شور مچاتے ہوئے اپنے گھروں کی طرف گئے یہ کہنے کے لئے کہ کانتی آنٹی آ گئیں۔ کالونی کی عورتوں نے سنا تو خوش ہو گئیں اور سب نے کہا کہ کل دیدی سے ملنے جائیں گے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ پریم جی کا نوکر کچھ سامان لے کر بازار سے آ رہا تھا۔ سنگیتا نے دیکھا تو آواز دی کہ چھوٹو، ذرا سننا۔ چھوٹو آیا تو اس سے پوچھا کہ کانتی دیدی کب آئیں؟ مگر یہ کیا؟ نوکر نے بتایا کہ یہ کانتی مالکن نہیں ہیں، یہ تو پریم مالک کی دوسری پتنی ہیں۔ یہ سننا تھا کہ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

# سحر ہونے تک

بزمِ ادب کے سالانہ جشن پر، ادیبوں اور شاعروں کو نوازے جانے کا اعلان حکومتِ ہند کی طرف سے ہوا تھا۔ ان کے اعزاز میں ایک محفل بھی منعقد کی گئی تھی۔ میری نشست صالحہ خانم کے قریب تھی۔ صالحہ خانم یوں تو سرکاری وکیل تھیں مگر خاندانی وراثت کی وجہ سے ایسے موقعوں پر خاص مہمان ہوا کرتی تھیں۔ میرا ان سے غائبانہ تعارف پہلے سے ہی تھا مگر ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔ باتیں ہونے لگیں تو انہوں نے مجھے اپنے گھر آنے کے لئے اصرار کیا۔ فون نمبر دے کر آنے کا دن طے کرنے کو کہا اور کہا کہ آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں، اسی وجہ سے تکلیف دے رہی ہوں۔ چھٹی کے دن میں نے ان کے گھر آنے کا وعدہ کر لیا۔

طے شدہ وقت کے مطابق میں اتوار کے دن ان کے بتائے ہوئے پتے پر جا پہنچی۔ ایک کوٹھی نما عمارت تھی۔ صدر دروازہ میں داخل ہونے کے بعد ایک لان تھا۔ سامنے ایک خوبصورت برآمدہ تھا جس کے نزدیک پھولوں کے گملے کی قطاریں تھیں۔ گل مہر اور پام کے درختوں کے علاوہ بھی پتوں والے پودے سلیقہ سے سجائے گئے تھے۔ اپریل کا مہینہ ہونے کی وجہ سے گل مہر کے سرخ پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ہلکی خنک ہواؤں میں نمی تھی۔ مجھے ماحول بڑا فرحت بخش لگ رہا تھا۔

صالحہ مجھے برآمدہ میں مل گئیں۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ کچھ دیر باہر بیٹھنے کے بعد وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے کر آ گئیں۔ میں سامنے ہی صوفہ پر بیٹھ

گئی۔

ایک کمرے کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ وہاں ایک بزرگ عورت چوکی پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ ان کی شکل مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی، پر یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا ہے۔ میں یہ بات سوچ ہی رہی تھی کہ خادمہ چائے وغیرہ لے کر آ گئی۔

صالحہ خانم سے باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر بعد صالحہ نے مجھے ایک ڈائری لا کر دی اور کہا کہ اس میں جو نوٹس اور کچھ بھولی بسری یادیں ہیں، انہیں آپ یکجا کر کے اس حقیقت کو ایک کہانی کی شکل عطا کر دیں تو ہماری دیرینہ خواہش پوری ہو جائے گی۔ میں نے کوشش کرنے کی حامی بھر لی۔

واپس آنے سے پہلے وہ مجھے اُن بزرگ عورت سے ملوانے لے گئیں اور کہا کہ یہ میری امی سکینہ خانم ہیں۔ پھر مجھے یکا یک یاد آ گیا کہ کئی سال پہلے میں نے انہیں ٹی۔وی پر دیکھا تھا۔ سکینہ خانم سے میرا تعارف کرانے کے بعد صالحہ نے ان کے نزدیک جا کر کچھ اور باتیں کیں تو انہوں نے سر کے اشارے سے ہاں کہی۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب بے حد کمزور آواز میں دیا۔

میں گھر آ گئی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں نے ڈائری کی ورق گردانی شروع کر دی۔ حالات اور واقعات کی پرتیں کھلتی چلی گئیں، سلسلے ملتے چلے گئے۔ دراصل ڈائری بڑی صاف گوئی سے لکھی گئی تھی۔ واقعات کی صحیح عکاسی کو مدنظر رکھ کر ہر بات دل کی گہرائیوں سے بیان کی گئی تھی۔

سکینہ خانم نے اپنے گزرے ہوئے واقعات اور مصیبتوں کا ذکر کچھ اس طرح کیا تھا کہ میں بہت متاثر تھی۔ ان کی درد میں ڈوبی ہوئی تحریر پڑھ کر میں نے اسی وقت طے کر لیا کہ جیسے بھی ہو، میں اس بزرگ ہستی کی آرزو کو ان کی خواہش کے

مطابق ایک کہانی کی شکل میں ڈھالنے کی کوشش ضرور کروں گی۔

لکھنؤ شہر کے نزدیک ایک گاؤں تھا، جس کا نام خان پور تھا۔ خان پور گاؤں کو حشمت خان نے بسایا تھا۔ اُس جگہ دُور تک ان کے آباواجداد کی زمینداری تھی۔ انہوں نے یہاں ایک نئی حویلی بھی بنوائی تھی۔ آگے پیچھے باغ باغیچے اور کھیت کھلیان بھی تھے۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے چھوٹی ذات کے کچھ غریبوں کو مفت میں تھوڑی تھوڑی زمینیں دے کر بسا لیا تھا۔ وہ سب اپنا چھوٹا موٹا روزگار تو کرتے ہی تھے، ان کے کھیتوں میں بھی بڑی خوشی سے کام کیا کرتے تھے۔ معاوضہ کی شکل میں اناج وغیرہ ملتا رہتا تھا۔ وہ سب خوش رہتے تھے کیونکہ حشمت خان بہت دریا دل انسان تھے۔

خان صاحب کو شعر وسخن کا بڑا شوق تھا۔ اکثر ان کے یہاں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ شہر سے شعراء بگھی اور فٹن پر بیٹھ کر مشاعرے میں شرکت کرنے آتے تھے۔ کئی روز دعوتیں ہوتی تھیں۔ عید بقرعید یا پھر کسی تقریب کے موقع پر قوالیوں کی محفلیں بھی جما کرتیں۔ مردوں میں جب محفلیں منعقد ہوتیں تو عورتیں اور لڑکیاں بھی چلمنوں کی آڑ میں بیٹھ کر ان سب چیزوں سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔

حشمت خان کو دو بیٹے تھے، گوہر خان اور شوکت خان۔ گوہر خان بڑے تھے۔ دونوں بیٹوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور سب صاحبِ اولاد تھے۔

سکینہ خانم شوکت خان کی بیٹی تھیں۔ وہ بڑی ذہین تھیں۔ کم عمری میں ہی انہوں نے قرآن پاک ختم کر لیا تھا۔ اسکول کالج میں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج کم تھا۔ ان کو عربی، اردو، فارسی کی تعلیم گھر پر ہی استادوں کے ذریعہ دلائی گئی تھی۔ حساب کتاب بھی سیکھ لیا تھا۔

بارہ برس کی ہونے کو آئیں تو تک بندی بھی کرنے لگیں۔ بیٹی کا رُجحان شعروادب کی طرف دیکھ کر شوکت خان بہت خوش تھے۔ انہوں نے اصلاح کی غرض سے اپنے ایک ملاقاتی شاعر کا انتظام کروادیا تھا۔ اصلاح لینے کے بعد سکینہ خانم کا اندازِ بیاں اور شعر کہنے کا ہنر رنگ لے آیا۔ وہ اپنی عمر کے حساب سے اچھے شعر کہنے لگی تھیں۔

سکینہ خانم سولہ برس کی ہوگئی تھیں۔ گوہر خان کے لڑکے سہراب خان بھی اب بیرسٹر کی ڈگری لے کر لندن سے واپس آگئے تھے۔ والدین نے پہلے سے ہی ان دونوں کے رشتہ کی بات طے کر رکھی تھی۔ چنانچہ سہراب آگئے تو شادی کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی۔ بڑی تیاریوں کے ساتھ ہنسی خوشی شادی انجام پاگئی۔ ہفتوں دھوم دھڑاکا ہوتا رہا۔ ملاقاتی اور رشتہ دار آتے جاتے رہے۔ بقیہ گھر کے سب لوگ بے حد خوش تھے۔ ہنسی خوشی سب کی زندگیاں گزر رہی تھیں کہ اچانک فرقہ وارانہ فساد کی بھنک لوگوں کے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔ یقین کرنا مشکل ہورہا تھا کہ جو لوگ اشاروں پر جان چھڑکنے کو تیار رہتے تھے، وہ بھی اب اپنے کرما فرماؤں کو نظر انداز کرنے پر تُل گئے تھے۔ ان میں جاہلوں اور غریبوں کی تعداد زیادہ تھی۔ آئے دن کہیں نہ کہیں حملہ ہوجانے کی خبر مل رہی تھی۔ ایسے میں یہ مسئلہ خان منزل میں بھی زیر غور تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ کہاں جائیں اور کیا انتظام کریں۔

یکا یک مغرب کے درمیان ہزاروں کی تعداد میں بلوائی ٹوٹ پڑے۔ کسی کو سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا اور سب آناً فاناً میں شہید کردیئے گئے۔ گھر میں چیخیں گونجتی رہیں اور لٹیرے دھن دولت لوٹتے رہے۔

اس وقت سکینہ گھر کے آخری کمرے میں تھیں۔ وہ اپنی تین ماہ کی بیٹی کو تھپک کر سلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ خدشہ تو لگا ہی ہوا تھا۔ چیخ پکار کی آوازیں سنی تو حالات کے بُری طرح بگڑ جانے کا اندازہ انہیں ہو گیا تھا۔ انہوں نے دوڑ کر اس طرف جانا چاہا مگر بچی کی محبت نے انہیں روک لیا۔ بڑی پھرتی سے انہوں نے خود کو ایک چادر میں لپیٹ لیا اور بچی کو کلیجہ سے لگا کر چھوٹی کھڑکی سے باغ کی طرف نکل گئیں۔ پیڑوں کی آڑ میں چھپتی چھپاتی رات کے اندھیرے میں شہری راستے کی طرف مڑ گئیں۔

ایک درخت کی آڑ لے کر انہوں نے اپنی حویلی کی طرف اشک بار آنکھوں سے دیکھا۔ بلند ہوتی ہوئی آگ انہیں دُور سے نظر آ رہی تھیں۔ وہ تڑپ اُٹھیں۔ کلیجہ پر چھریاں چل رہی تھیں۔ ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ ہانپتی ہوئی بیٹھ گئیں۔ بچی کو سینے سے لگا لیا اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ گرتی پڑتی وہ اس گلی کی طرف مڑ گئیں، جہاں دادا جان کے ساتھ بچپن میں مسجد تک آیا کرتی تھیں۔ گلی سنسان تھی، سارے دروازے بند تھے۔ سسکتی ہوئی وہ مسجد کے دروازہ کے سامنے سیڑھیوں پر لڑھک گئیں۔ کسی کے گرنے کی آواز سن کر ایک آدمی نے جھانک کر دیکھا۔ ایک بچی کے ساتھ بدحواس پڑی ہوئی ایک عورت کو دیکھا تو لوگوں نے انہیں اندر کی طرف گھسیٹ لیا۔ منہ پر پانی چھڑک کر ہوش میں لایا۔ وہاں بہت سے مرد اور عورتیں تھیں۔ عورتوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے دونوں کو سنبھال لیا۔ مرد اور عورتیں دربارِ الٰہی میں جان اور عزت و آبرو کی حفاظت کی دعاؤں میں مشغول تھے۔

ویسے یہاں کے حالات ابھی اتنے بُرے نہیں تھے۔ جب سویرا ہوا تو سکینہ نے ایک کونے میں قوالن بوا کو پڑی ہوئی پایا۔ قوالن بوا ان کے یہاں برابر آیا

کرتی تھیں۔ ان کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی مگر شوہر گزر چکے تھے۔ پہلے تو خان منزل میں وہ اپنی نانی کے ہمراہ آیا کرتی تھیں۔ نانی کے انتقال کے بعد بھی وہ اکثر خان منزل میں آتی رہتی تھیں۔ سبھوں کے اسرار پر کئی کئی روز ٹھہری رہتیں۔ عورتیں ان کی گائی ہوئی نعتیں اور قوالیاں سن کر بہت خوش ہوتیں۔ جو کچھ ملتا، اسے خوشی خوشی لے کر اپنے گھر لوٹ جاتیں۔

قوالن بوا کا نام مہرن یا مہر النساء تھا۔ سکینہ مہرن کو دیکھ ہی رہی تھیں کہ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ جب انہوں نے سکینہ خانم کو اس حال میں دیکھا تو وہ رو پڑیں۔ سب کچھ سمجھ کر انہوں نے سکینہ کو بانہوں میں بھر لیا۔ خود تو روتی رہیں لیکن سکینہ کو دلاسا دیتی رہیں۔

خان منزل پر حملہ ہو جانے کی خبر انہیں رات میں ہی ہو گئی تھی۔ وہ سن کر بڑی بے چین تھیں۔ بار بار سب کی شکلیں ان کی آنکھوں میں گھوم رہی تھیں۔ سکینہ کو زندہ دیکھ کر ان کے دل کو تھوڑا سا قرار ملا تھا۔ انہوں نے سمجھانے والے انداز میں سکینہ سے کہا، بیٹی اوپر والے پر بھروسہ رکھ، جب اس نے تیری ننھی سی بچی کی حفاظت کی ہے تو آگے بھی حفاظت کرے گا۔ زندگی باقی رہی تو اس بچی کے سہارے زندگی کاٹ لینا۔ میں نے تیرے گھر کا نمک کھایا ہے۔ اب تک تیرے گھر کے سہارے زندہ رہی۔ اب تو مرتے دم تک تیرا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔

اس عمر میں شوہر سے جدائی، والدین اور عزیزوں سے بچھڑنے کا غم، سب کی حادثاتی موت نے سکینہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ایسے میں مہرن انہیں دلاسہ دیتی رہیں۔

کسی نے خبر دی کہ بسیں آنے والی ہیں، جو لوگوں کو رفیوجی کیمپوں میں

حفاظت کے لئے لے جائیں گی۔ یہ کیمپ کہاں ہوں گے، اس کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ کچھ دیر کے بعد گاڑیاں آنے لگیں۔ جب سب لوگ جانے لگے تو مہرن بھی سکینہ اور ان کی بچی کو لے کر بس میں سوار ہوگئیں۔ پولس کی گاڑیاں بھی ساتھ چل رہی تھیں جس میں لیڈر لوگ بھی تھے۔ گاڑیاں خاص مقاموں پر رُکتیں تھیں، پھر لیڈروں کے اشارہ پر چل پڑتی تھیں۔ خیر رُکتی تھمتی گاڑی کہاں آکر رُکی، سکینہ کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ ان لوگوں کو ایک کیمپ میں اُتارا گیا جہاں ان کے ہمراہ بہت سی عورتیں اور مرد بھی تھے۔ کچھ دیر کے بعد لیڈروں نے کھانے پینے کا سامان تقسیم کروانا شروع کر دیا تھا۔

دو روز کے بعد پھر گاڑیوں میں رفیوجی بھر بھر کر آنے لگے۔ اتنے لوگوں کے ایک ہی جگہ پر آجانے سے افراتفری مچ گئی۔ کیمپ میں جگہ کم پڑنے لگی۔ لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونسے جانے لگے۔

سکینہ ایسا ماحول دیکھ کر اتنا گھبرا گئیں کہ مہرن کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ صورتِ حال اتنی بگڑ گئی کہ انتظامیہ کو بھی مشکلیں ہونے لگیں۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور پھر اعلان کیا گیا کہ کچھ گاڑیاں صوبہ بہار جارہی ہیں، جن کو وہاں جانا ہو، وہ گاڑیوں میں سوار ہوجائیں۔ سکینہ نے سنا تو وہ جانے کو تیار ہوگئیں۔ ویسے بھی اس علاقہ سے دور چلی جانا چاہتی تھیں۔ وہ اپنی پہچان کو بھی کھو دینا چاہتی تھیں۔ اتنی دل برداشتہ ہو چکی تھیں کہ اگر بیٹی کی فکر نہیں ہوتی تو گھبرا کے مرگئی ہوتیں۔

سکینہ خانم نے فیصلہ کرلیا۔ بھاری قدموں سے مہرن اور بچی کے ساتھ صوبہ بہار جانے والی گاڑی پر سوار ہوگئیں۔ دن بھر کی مسافرت کے بعد ان کی گاڑی صوبہ بہار کے عظیم آباد شہر میں ایک مدرسہ میں آکر رُکی۔ وہاں بھی کیمپ لگا ہوا تھا۔ مگر بہت بڑی جگہ ہونے کی وجہ سے حالات اتنے خراب نہیں تھے۔ لوگ آرام سے

اُترتے گئے اور انہیں کشادہ کمروں میں جگہیں مل گئیں۔

لوہے کے گیٹ کے اندر کافی کشادہ میدان تھا۔ اندر بڑے بڑے ہال تھے۔ طالب علموں کے لئے بنائے گئے پچاسوں کمرے تھے۔ فساد کی وجہ سے مدرسہ بند کر دیا گیا تھا۔ ہوسٹل بھی خالی پڑے تھے۔ یہاں آجانے پر سکینہ اور مہرن کو تھوڑی راحت محسوس ہو رہی تھی۔

سب کو راشن اور کپڑے ملنے لگے تھے۔ ضرورت کی چیزیں کم و بیش فراہم کی جا رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ماحول سازگار ہونے لگے تھے۔ جب حالات کچھ بہتر ہو گئے تو ایک دن اس کیمپ کے انچارج ڈائرکٹر سید حسن صاحب کیمپ کا معائنہ کرنے عورتوں کے کیمپ میں گئے۔ انہوں نے باری باری سے سبھوں کی خیر و عافیت دریافت کی۔ وہاں انہوں نے ہر طبقہ کی عورتوں اور جاہل لڑکیوں کو دیکھا۔ انہیں عورتوں کے درمیان کچھ اچھے گھرانوں کی خواتین بھی تھیں جو تھوڑا بہت پڑھی لکھی تھیں۔

سبھوں سے باتیں ہو چکیں تو سکینہ خانم نے آکر انہیں جھک کر سلام کیا اور بغیر کچھ کہے ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ انچارج صاحب نے انہیں بلا کر باتیں کیں، ان کی تعلیم کے بارے میں جاننا چاہا۔ سکینہ نے عربی، اردو، فارسی، حساب اور تھوڑی بہت انگریزی کی وضاحت کی تو سید صاحب بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ کل سے آپ یہاں رہنے والی لڑکیوں کو پڑھائیں۔ میں آپ کو ہیڈ استانی کی جگہ پر بحال کر رہا ہوں۔ آپ کی مدد کے لئے ان عورتوں کو بھی رکھ لیا جائے گا جنہیں آپ بہتر سمجھیں۔ آپ کو اور ان عورتوں کو بھی ہر مہینہ مشاہرہ کی رقم جوطے کی جائے گی، ملتی رہے گی۔ سکینہ خوش ہو گئیں۔ سید صاحب کے کہنے کے مطابق دو عورتوں کے بارے

میں انہوں نے بتا دیا۔ وقت گزرتا گیا۔ سکینہ لڑکیوں کو تعلیم دیتی رہیں اور انہیں ہر مہینہ تنخواہ کی شکل میں کچھ پیسے ملتے رہے۔

وہاں کا ماحول اب محلّہ جیسا ہو گیا تھا۔ ایک فیملی پر ایک کمرہ مل گیا تھا۔ جو راشن ملتا تھا، برآمدہ یا آنگن میں سب کا کھانا پکتا تھا۔ اب ان سب کے لبوں پر تھوڑی مسکراہٹ بھی نمودار ہونے لگی تھی۔ جن کے لڑکے اور لڑکیاں شادی کے قابل تھے، ان کے رشتے بھی طے پانے لگے تھے۔ اپنی برادری میں لوگ اپنے بیٹے بیٹیوں کا نکاح کر رہے تھے۔ رسم و رسومات کے درمیان گانے بجانے بھی شروع ہو گئے تھے۔ مہرن بھی گیت اور قوالیاں گا کر ماحول کو خوشگوار بنا رہی تھیں۔ ان سب چیزوں سے غم کے ماروں کو تھوڑا خوش ہونے کا موقع مل رہا تھا۔

ایک سال ہونے کو آئے تو لوگوں کو کیمپ چھوڑ دینے کو کہا گیا۔ حالات پر قابو پا لیا گیا تھا۔ حکومت کی طرف سے کچھ پیسے بانٹے گئے اور کہا گیا کہ آپ لوگ اب اپنی گزر بسر کا انتظام خود کیجئے۔ رفتہ رفتہ سبھوں کو کیمپ چھوڑنا پڑا۔ جن کے پاس جمع پونجی تھی، انہوں نے اپنا روزگار کرنے کی سوچ لی اور جن کے پاس کچھ نہیں تھا وہ دوسروں کے ساتھ لگ گئے۔ اسی طرح نیچے طبقہ کے مرد اور عورتوں نے بڑے گھروں کو کھوج کر دائی نوکر کا کام کرنے کی سوچ بنالی۔

سکینہ خانم نے بھی مہرن کو ساتھ لے کر ایک کمرے کی تلاش شروع کر دی۔ کئی دنوں کی محنت کے بعد انہیں عظیم آباد کے پرانے علاقہ میں ایک کمرہ اور ایک برآمدے والا مکان مل گیا۔ تنخواہ کے پیسے اور ریلیف فنڈ کے بانٹے گئے پیسوں میں سے سکینہ نے مکان کا پیشگی کرایہ ادا کیا۔ مہرن اور بیٹی کے ساتھ اس مکان میں رہنے لگیں۔

# فہرست مضامین


| | | |
|---|---|---|
| ◉ 'کائنات' سے پہلے | اسلم جاوداں | |
| ◉ پیش لفظ | ثریا جبیں قادری | |
| ◉ مختصر تعارف | — | 12 |

**خود نوشت**

| | | |
|---|---|---|
| ◉ یادیں بچپن کی | — | 14 |
| ◉ سفر کشمیر کا | — | 20 |

**افسانے / کہانیاں**

| | | |
|---|---|---|
| ◉ دوسری عورت | — | 28 |
| ◉ سحر ہونے تک | — | 34 |
| ◉ قصوروار کون؟ | — | 51 |
| ◉ یقین | — | 57 |
| ◉ لاڈلی | — | 64 |
| ◉ بے ادب بدنصیب | — | 73 |
| ◉ ایک عجیب واقعہ | — | 88 |

**نظمیں**

| | | |
|---|---|---|
| ◉ خوش نصیبی | — | 92 |

جب سکینہ خانم منزل سے نکلی تھیں تو ان کے جسم پر سونے کے زیورات تھے۔ بھاگتے وقت سکینہ نے انہیں ایک سنسان جگہ پر اُتار ڈالا تھا۔ اپنے دوپٹہ کے کونے میں اچھی طرح باندھ کر کمر میں کس لیا تھا۔

دو مہینے گزر جانے کے بعد انہیں آگے کی فکر ہونے لگی تھی۔ ابھی وہ دونوں کرایہ ادا کرنے کے بارے میں باتیں ہی کر رہی تھیں کہ مکان مالک کو پاکستان جانے کی دُھن سوار ہوگئی۔ وہ اس مکان کو بیچ دینے پر آمادہ ہوگیا۔ مکان چھوٹا تھا مگر زیادہ پرانا نہیں تھا۔ اوپر نیچے ملا کر چھوٹے بڑے چار کمرے تھے۔ باہر برآمدہ اور اندر آنگن بھی تھا۔ سکینہ اور مہرن نے آپس میں مشورہ کیا اور مکان مالک سے اسے خرید لینے کی بات کی۔ ایک ہفتہ کی مہلت مانگی۔ اس درمیان ان دونوں نے الگ الگ سناروں کے ہاتھ جھمکے اور گلوبند بیچ دیئے۔ مہرون نے آرزو مِنّت کر کے ایک ہزار میں مکان سکینہ خانم کے نام لکھوالیا۔ مکان سکینہ کے نام ہوتو گیا، اب گھر کا خرچ چلانے کی بات سامنے آنے لگی۔ دو ہاتھ کے کڑے اور ایک ہار بیچ رہے تھے جسے سکینہ اپنی بیٹی کے لئے رکھنا چاہتی تھیں۔

مہرن نے کہا گھبرا مت بیٹی، تو جانتی ہے کہ میرے پاس بھی کچھ پیسے ہیں جب تک کام چلے گا، پھر میں کچھ سوچوں گی۔ مہرن نے سکینہ کو دلاسہ دیا۔ دوسرے ہی دن وہ گھر سے نکل کر نان بائی کی دوکان پر پہنچ گئیں۔ ایک ٹوکری میں بسکٹ کلچے لے کر آئیں۔ سکینہ کو دکھایا اور بات کی۔ جب شام ہوئی تو محلّہ کے گھروں میں بیچ آئیں۔ روز وہ سامان لاتیں اور شام ہوتے ہی بیچ آتیں۔ پانچ چھ روپیہ کا منافع ہو رہا تھا۔ اسی سے ملا جلا کر گھر کا خرچہ چل رہا تھا۔

وقت گزر رہا تھا لیکن سکینہ مطمئن نہیں تھیں۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ دو سال

کے بعد جب ان کی بیٹی صالحہ تین سال کی ہو جائے گی تو پھر اس کی پڑھائی کا سلسلہ کیسے شروع ہوگا اور ان کا بیٹی کو پڑھا لکھا کر وکیل جج بنانے کا خواب کیسے پورا ہوگا۔

ایک دن وہ مہرن سے یہی باتیں کر رہی تھیں تو مہرن نے کہا کہ تمہیں بیٹی کو پڑھانا لکھانا ہے، اس کی اچھی پرورش کرنی ہے تو قلم پکڑ لو اور لکھنا شروع کر دو کیونکہ تم میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ پہلے بھی تم لکھتی رہی ہو۔

مہرن کے اُکسانے پر انہوں نے مضبوطی سے قلم ہاتھ میں لے لیا اور لکھنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ وہ لکھتی رہیں۔ یادوں کی داستاں شعروں کے پیمانے میں ڈھالتی رہیں۔ دل کے پھپھولوں کو پھوڑتی رہیں اور غزل تیار ہوتی گئی۔

جب کئی غزلیں مکمل ہو گئیں تب سکینہ خانم نے اس میں سے کچھ غزلوں کو ایک سادہ لفافہ میں بند کیا۔ ایک مقامی روزنامہ کے مالک کا نام اور دفتر کا پتہ لکھا۔ پھر ایک طرف اپنا نام اور گھر کا پتہ لکھا۔ مہرن کو کچھ سمجھایا۔ مہرون نے چادر اوڑھی، لفافہ بغل میں دبایا اور اپنی جوتی چٹکاتی ہوئی نکل پڑیں۔

دن کے گیارہ بجے کے قریب وہ روزنامہ ''سویرا'' کے دفتر پہنچ گئیں۔ دفتر کھل چکا تھا۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ جب چپراسی نے ان سے آنے کی وجہ دریافت کی تب انہوں نے لفافہ ایڈیٹر صاحب کو دینے کے لئے کہا۔ چپراسی نے لفافہ جا کر روزنامہ کے مالک کو دے دیا اور کہا کہ ایک خاتون نے دیا ہے۔

ایڈیٹر صاحب نے خاتون کا نام سنا تو انہیں بیٹھانے کے لئے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے خیرن سے بات کی اور پوچھا کہ آپ کون ہیں۔ خیرن نے اپنا نام بتایا اور کہا کہ سکینہ خانم میری بیٹی ہیں۔

کلام صدیقی کی عمر پچپن ساٹھ (۵۵-۶۰) سال کے درمیان ہوگی۔ وہ ایک شریف آدمی تھے۔ انہوں نے سکینہ خانم کی غزلیں جب سے پڑھی تھیں، بہت متاثر تھے۔ سکینہ خانم سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ دوسرے دن خیرن نے سکینہ سے ملاقات کرادینے کا وعدہ کرلیا۔ سلام کے بعد انہوں نے کلام صدیقی سے اجازت مانگی اور گھر چلی آئیں۔

دوسرے دن ایڈیٹر صاحب شام کے چار بجے سکینہ خانم سے ملنے ان کے گھر گئے۔ مہرن نے انہیں باہر کے کمرے میں بٹھایا اور سکینہ کو خبر کی۔ سکینہ نے دوپٹہ اچھی طرح اوڑھا اور غرارہ سنبھالتی ہوئی کلام صدیقی سے ملنے آگئیں۔ ایڈیٹر صاحب نے جب انہیں دیکھا تو وہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ انہوں نے سوچا کہ اتنی کم عمر لڑکی اور اتنی ذہین۔ سکینہ خانم نے اپنے حالات مختصر لفظوں میں بیان کئے۔ صدیقی صاحب نے انہیں بیٹی کہہ کر مخاطب کیا۔

جب وہ جانے لگے تو ان کے ہاتھ پر پیشگی کے طور پر کچھ روپے رکھ دیئے اور کہا کہ تمہاری غزلیں کل سے ہی چھپنے لگیں گی۔ تم بہت باصلاحیت ہو، لکھتی رہو۔

سکینہ خانم کی غزلیں چھپنے لگیں۔ لوگوں نے پسند بھی کیا اور کچھ اہلِ قلم حضرات نے روزنامہ ''سویرا'' کے ذریعہ انہیں مبارک باد بھی دی۔ کچھ پرچوں کے مالکوں نے ان سے رابطہ قائم کیا۔ اخبار کے علاوہ بھی ان کے لکھے گئے مضمون اور کہانیاں دوسرے پرچوں میں بھی چھپنے لگیں۔

سکینہ خانم کی بیٹی صالحہ بارہ (۱۲) برس کی ہوگئی تھی۔ اس نے مقامی ہائی اسکول سے مڈل کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ وہ اپنی ماں ہی کی طرح بے حد ذہین تھی۔ صالحہ کے اسکول میں ایک کرسچن لیڈی ٹیچر تھی جن کا نام روزی تھا۔ ان

کو ایک کمرے کی ضرورت تھی۔ جب صالحہ نے ماں سے کہا تو سکینہ نے گھر کے اوپر کا ایک کمرہ کرایہ پر دینے کے بارے میں خیرن سے باتیں کیں۔ دونوں کے مشورہ سے کمرہ روزی کو کرایہ پر دے دیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد روزی اپنے آٹھ سال کے بھائی کے ساتھ آکر رہنے لگی۔ روزی کے آجانے سے ایک تو آمدنی کی صورت نکل آئی تھی، دوسرے صالحہ کو بھی روزی سے پڑھائی میں مدد مل رہی تھی۔

کلام صدیقی اکثر صحافت کے سلسلہ میں باتیں کرنے سکینہ سے ملنے آجاتے تھے۔ وہ ان کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار رہتے تھے۔ انہیں سکینہ خانم سے بڑی ہمدردی تھی۔ انہوں نے انہیں اپنے گھر بلا کر اپنی فیملی سے بھی ملوایا تھا۔ دونوں گھروں میں ملنے ملانے کا سلسلہ قائم ہوگیا تھا۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا تھا جو بی۔اے فائنل میں تھا۔ اس کا ارادہ وکالت پڑھنے کا تھا۔

ایک بار کلام صاحب آئے تو سکینہ نے اپنی ایک غزل انہیں سنائی۔ گا کر سنائی گئی غزل کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان کی دلفریب آواز سن کر کلام صاحب نے انہیں دل سے داد دی اور کہا کہ بیٹی تم اپنی آواز کو لوگوں کے قریب لاؤ۔ اگر تم راضی ہوگئی تو میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔ سکینہ چپ ہوگئیں اور کچھ سوچنے لگیں۔

جھمری تلیا میں ریڈیو کے لئے پلانٹ کا کام مکمل ہوگیا تھا۔ اب پٹنہ میں ریڈیو اسٹیشن کھل گیا تھا۔ خبریں نشر ہونی شروع ہوگئی تھیں۔ اس کے علاوہ پروگرام کے مطابق ڈرامے، فلمی گانے، لوک گیت وغیرہ کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ اکثر شاعروں کو بھی اپنا کلام سنانے کا موقع مل رہا تھا۔

چونکہ کلام صدیقی صحافی تھے، ان کا روزنامہ لوگوں میں بہت مقبول تھا۔ وہ

ایک قابل آدمی تھے اور بہت کھلا دماغ رکھتے تھے، اس لئے سب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اکثر لوگ ان سے مشورے بھی لیتے تھے۔ آکاش وانی پٹنہ کے نمائندوں اور وہاں کام کرنے والے لوگوں سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

ایک بار باتوں باتوں میں انہوں نے سکینہ خانم کی شاعری اور طرزِ ترنم کا ذکر وہاں کے نشریات کے ناظم سے کیا اور کہا کہ اگر ان کی آواز کے ساتھ ساز کی بھی ہم آہنگی ہو جائے تو بہتر پروگرام تیار ہو سکتا ہے۔ ناظم کو ان کی بات میں وزن کا احساس ہوا تو انہوں نے سکینہ کو ریڈیو اسٹیشن میں بلا کر خود سے ملوانے کے لئے ان سے خوشامد کرنی شروع کر دی۔

صدیقی صاحب نے سکینہ سے بات کرنے کا وعدہ کر لیا۔ پھر ایک دن وہ سکینہ خانم۔ ، وہی بات کہنے لگے۔ سکینہ نے سوچ لیا تھا کہ انہیں پیسہ کمانا ہے۔ اپنی بیٹی کی پڑھائی جاری رکھنی ہے، اس کا مستقبل سنوارنا ہے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ ویسے بھی ان کے کون سے رشتہ دار زندہ ہیں جو ان پر تنقید کریں گے۔

ریڈیو اسٹیشن میں سکینہ خانم کی ریہرسل کی شروعات ہو گئی۔ ان کی گائی ہوئی غزلیں اور قوالیاں بھی لوگوں کو سنائی پڑنے لگیں۔ غزلوں کا طرزِ بیاں زیادہ تر وہ خود ہی تراشتیں، مگر قوالیوں میں مہرن کا لب ولہجہ ہوتا۔

اس طرح کئی سال گزر گئے۔ سکینہ خانم آئے دن پروگراموں میں مشغول رہتیں۔ گھر کی ساری ذمہ داری مہرن پر تھی۔ انہوں نے ایک اچھی کالونی میں مکان بھی بنوا لیا تھا۔ گھر میں مہرن کی مدد کے لئے دو مامائیں تھیں۔ نوکر اور مددگار بھی تھے۔ صالحہ نے بڑے اچھے نمبروں سے وکالت پاس کر لیا تھا۔ سکینہ خانم بہت خوش تھیں۔ بیٹی نے بڑی لگن سے ماں کے خواب کو پورا کر دیا تھا۔ مہرن نے بھی صالحہ کی

سوسو بلائیں لیں۔ سکینہ خانم مہرن سے گلے مل کر خوشی کے آنسو بہاتی رہیں اور کہنے لگیں کہ بوا، آپ نہ ہوتیں تو میں زندہ نہیں رہتی۔ سب کچھ چھین کر بھی پروردگار نے مجھے آپ کی شکل میں ماں باپ اور شوہر کے جیسا سہارا عطا کر دیا۔ مہرن نے بھی روتے ہوئے جواب دیا، میں بھی تو بے سہارا تھی، میرا بھی تو کوئی نہیں تھا۔ تیری بیٹی نے بچپن سے آج تک اتنے نخرے کئے ہیں کہ میں اسی میں بہلتی رہی۔ یہ بات مہرون نے صالحہ کو دیکھ کر کہی تھی کیونکہ صالحہ ان کی باتیں سن کر آبدیدہ ہو رہی تھی۔ جب صالحہ نے اپنے نخرے کی بات سنی تو کہا، پلیز نتا! اب کہاں نخرے کرتی ہوں، پھر تینوں ہنس پڑیں۔

مہرن اب بیمار رہنے لگی تھیں اس لئے سکینہ نے اپنی مصروفیت کم کر دی تھی۔ وہ خود ہی خادماؤں کو کام سمجھا کر زیادہ وقت مہرن کی دیکھ بھال میں صرف کرتیں۔ مہرن کو صالحہ کی شادی دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ سکینہ بھی اب صالحہ کی شادی کے لئے فکر مند تھیں۔

جب صالحہ نے بی۔اے پاس کرنے کے بعد لاء کالج میں داخلہ لیا تھا تو ان کی ملاقات وہاں توقیر صدیقی سے ہوئی تھی۔ توقیر صدیقی کلام صدیقی کے بیٹے تھے (وہی کلام صدیقی جو روزنامہ ''سویرا'' کے مالک تھے)۔ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ ویسے تو توقیر وکالت پاس کر چکے تھے لیکن کسی کام کے سلسلے میں اکثر ان کا آنا لاء کالج میں ہوتا رہتا تھا۔ صالحہ کی مدد بھی کرتے تھے۔ کئی بار توقیر صدیقی، سکینہ خانم سے ملنے آ چکے تھے۔ ہر بار انہوں نے صالحہ کی ذہانت اور قابلیت کی تعریف کی تھی۔ وہ ایک شہر کے مشہور وکیل کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ یہ خبر سکینہ کو صالحہ نے دی تھی۔ جب صالحہ کے امتحانات ہوتے تو

وکیل تو قیر صدیقی اسے پڑھانے آجاتے۔ سکینہ کو یہ پتہ نہیں تھا کہ صالحہ نے بلایا ہے یا وہ خود ہی آتے ہیں۔ بہرحال تو قیر سے اتنی قربت پر انہیں بیٹی پر شک ہو گیا تھا۔

ایک دن سکینہ خانم نے صالحہ سے شادی کے بارے میں اس کی پسند دریافت کی۔ صالحہ نے شرماتے ہوئے تو قیر صدیقی کا نام لے لیا اور ماں سے کہا کہ ایک دن انہوں نے ہی اپنے بارے میں میری پسند جاننا چاہی تھی۔ جب دونوں کی پسند کی وضاحت سکینہ کو مل گئی تب انہوں نے تو قیر کی امی سے اس سلسلے میں ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔

تو قیر سے باتیں کرنے کے بعد انہوں نے وقت مقرر کیا اور ہونے والے سمدھیانے پہنچ گئیں۔ وہاں سبھوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور صالحہ کو اپنی پہلی پسند بتایا۔ صالحہ واقعی اپنی ماں کی طرح ہی خوبصورت، نازک اندام، کم گو اور ذہین تھی۔ ورثہ میں انہیں بھی تھوڑا شاعرانہ مزاج مل گیا تھا۔ وہ بھی کبھی کبھی دو چار مصرعے ادا کر لیتیں

خیر، جلد ہی صالحہ کی شادی کی تاریخ طے کر لی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد شادی بھی ہو گئی۔ سکینہ خانم اور مہرن نے خوب ارمان نکالے۔ سکینہ خانم بڑی خوش تھیں، انہیں ایک اچھا اور محبت دار گھرانا ملا تھا۔ داماد بھی ایسا جیسے کہ ان کا بیٹا ہو۔ وہ بھی اپنے والد کلام صدیقی کی طرح شریف اور نیک دل تھا۔

سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا کہ ایک دن مہرن اپنی ساری محبتیں اپنی منہ بولی بیٹی سکینہ پر لٹا کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ مہرن کے انتقال کے بعد سکینہ خانم نے جائے نماز بچھالی۔ وہ اپنا سارا وقت عبادت کرنے میں گزار دیتیں۔

اب تو قیر صدیقی ہائی کورٹ میں جج تھے اور صالحہ خانم سرکاری وکیل۔ ان کی بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ بیٹا ڈاکٹر ہے، اس کی شادی بھی ہونے والی ہے۔

قصہ کے اختتام پر تھوڑی وضاحت درکار تھی اس لئے میں سکینہ خانم سے ملنے چلی گئی۔ وہ مجھ سے بہت خوش تھیں۔ مجھے گلے لگایا، میرے ہاتھوں کو چوما اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ ملتے رہنے کا وعدہ لیا۔ اپنی انگلیوں میں پہنی ہوئی ہیرے اور یاقوت جڑی دو انگوٹھیاں میری انگلیوں میں پہنا دیں۔

جب میں آنے لگی تو انہوں نے مجھے روکا۔ بہت پہلے کے لکھے گئے چند اشعار میرے ہاتھوں میں تھما دئے اور انہیں بھی لکھ دینے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے وعدہ کر لیا۔ مصرعے ملاحظہ فرمائیں :

؎ ایسی ہوا چلی ہے کہ بنیاد ہل گئی
چھینٹے اُڑے جو خون کے محراب گر گئی

☆

؎ خلوتوں کی شوخیاں رنج و غم میں کھو گئیں
بے حجاب گھر ہوئے چلمنیں بکھر گئیں

☆

؎ ایک آس تھی جو دل کو لبھانے کے لئے تھی
آنکھوں میں تیری یاد سجانے کے لئے تھی

❁

# قصوروار کون ؟

ابّا کا بزنس حامد بھائی نے اچھی طرح سنبھال لیا تھا۔ صمد بھائی نے بھی اپنی تعلیم پوری کر لی تھی اور وہ بھی بھائی کے ساتھ ہی بزنس میں لگ گئے تھے۔

اماں نے پہلے ہی اپنے دونوں بیٹوں کا رشتہ اپنی بھتیجیوں کے ساتھ طے کر رکھا تھا۔ چنانچہ باری باری نے دونوں بہنیں اماں کی بہوئیں بن کر ایک ہی گھر میں آ گئیں۔ سال بھر بعد بڑی بہو کو بیٹا ہوا۔ اماں نے اس کا نام نایاب رکھا۔ نایاب کی پیدائش کے بعد بڑی بہو کو اچانک خون کی کمی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے انہیں مکمل آرام کرنے کی صلاح دے دی۔ ایسے میں اماں کو کسی ایسی عورت کی تلاش تھی جو بچے کو ماں کی طرح پال سکے۔ انہوں نے اس کا ذکر اپنے ملازموں سے کیا۔

جب رمضانی میاں کو اس کی خبر ملی تب انہوں نے اماں کو اپنی اُس بہن کے بارے میں بتایا جس کا شوہر چھ ماہ پہلے ایک حادثے کا شکار ہو چکا تھا۔ دو مہینہ پہلے ایک بچہ اسے ہوا تھا جو چند دنوں کے بعد چل بسا۔ صدمہ کی وجہ سے اب ان کی بہن خود فراموشی کے عالم میں جی رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ شاید بابا کی دیکھ بھال میں وہ اپنے غم کو بھول جائے۔ اماں نے بہو بیٹے سے مشورہ کر کے رمضانی کو گاؤں روانہ کر دیا۔ دو تین دنوں کے بعد رمضانی میاں نصیبن کو اپنے ساتھ لے کر آ گئے۔

سفید کپڑوں میں لپٹی گاؤں کی ایک بھولی بھالی لڑکی سب کے سامنے کھڑی تھی۔ دیہاتی ماحول میں پلی اس معصوم سی لڑکی کو شوہر اور بچے کا غم کھائے

جارہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر سب کو بہت افسوس ہوا۔ اماں نے اسے دلاسہ دیا اور چھوٹی بھابھی کو اشاروں میں کچھ سمجھایا۔ چھوٹی بھابھی اسے اپنے ساتھ لے کر چلی گئیں۔

شام کو اماں نے جب نایاب کو نصیبن کی گود میں دیا تو ممتا کی ماری ماں نے بچے کو سینہ سے لگالیا۔ خوش ہوگئی۔ اسی دن سے بچے کی دیکھ بھال میں مشغول ہوگئی۔ بچہ بھی اس سے اتنا مانوس ہوگیا کہ اس کے علاوہ کسی کے پاس چین سے نہیں رہتا تھا۔ بچے سے اس کا لگاؤ دیکھ کر سب خوش بھی تھے اور مطمئن بھی۔

بڑی بھابھی کو پورا آرام مل گیا تھا۔ وہ رُو بہ صحت ہورہی تھیں۔ ماں کی نگرانی اور نصیبن کی شفقت کے سایہ میں نایاب اب ڈیڑھ سال کے ہوچکے تھے۔

اِدھر چھوٹی بھابھی بھی ایک بچی کی ماں بن گئی تھیں۔ پوتے کے بعد پوتی کو پاکر اماں نہال ہوگئیں۔ انہوں نے اس کا نام راحت رکھا۔ اب راحت کو بھی سنبھالنے کی ذمہ داری نصیبن پر ہی تھی۔ دونوں بچوں کو باری باری سے وہی سنبھال رہی تھی۔ بچے بھی اسی کے پاس خوش رہتے۔

صمد بھائی کو دوبئی میں جاب مل گئی تھی۔ کچھ دنوں بعد جب وہ آئے تو چھوٹی بھابھی اور تین سال کی راحت کو لے کر دوبئی چلے گئے۔ دو تین برس کے وقفہ کے بعد وہ لوگ ہندوستان آتے تھے۔ فون پر باتوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ بچے بڑے ہورہے تھے۔ ان کی پڑھائی لکھائی، پسند ناپسند کی باتیں دونوں بہنیں کرتی رہتی تھیں۔

اس بار صمد بھائی فیملی کے ساتھ ہندوستان آئے تو راحت کی خوبصورتی اور رکھ رکھاؤ کا سلیقہ دیکھ کر سب لوگ بہت خوش ہوئے۔ دل ہی دل میں نایاب بھی

| | | |
|---|---|---|
| ◉ آرزو | — | 93 |
| ◉ اُردو زبان | — | 94 |
| ◉ کسک | — | 96 |
| ◉ قلم | — | 99 |
| ◉ جُدائی | — | 101 |
| ◉ اتحادِ ملت | — | 102 |
| ◉ برہا | — | 104 |
| ◉ شکایت | — | 105 |
| ◉ ایک خواب | — | 106 |
| ◉ آسان نہیں ہے | — | 107 |
| ◉ ایک سوال | — | 108 |
| ◉ ضد کا انجام | — | 110 |
| ◉ گیت | — | 112 |
| ◉ مغرور ہو گئے | — | 113 |
| ◉ غلط فہمی | — | 115 |
| ◉ موسمِ سرما | — | 117 |
| ◉ بسنت بہار | — | 119 |
| ◉ شیطان بہت ہیں | — | 120 |
| ◉ سزا جھیل رہے ہیں | — | 122 |

اسے بے حد پسند کرنے لگے۔ سب لوگوں سے تو وہ خوب باتیں کرتی مگر نایاب جب بھی اس سے مخاطب ہوتے، وہ ہوں، ہاں میں جواب دے کر کھسک جاتی۔ نایاب کو اس یہ ادا بھی بہت بھاتی تھی۔

دن کے تین بج رہے تھے۔ نایاب کے ایم. بی. اے. کے امتحان کا آج آخری پیپر تھا۔ وہ گھر آئے تو پاپا ممی کو چچا چچی کے ساتھ باتوں میں مشغول پایا۔ ڈرائنگ روم سے ہو کر گھر میں جانا چاہ رہے تھے کہ اپنا اور راحت کا نام سن کر ٹھٹھک گئے۔ دو منٹ رُک کر آنگن کے دروازہ سے ہوتے ہوئے دادی اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

دیکھا کہ راحت دادی اماں کے پلنگ پر بیٹھی باتیں کر رہی ہے۔ وہ اپنی کسی سہیلی کی بیوقوفی کا قصہ دادی کو اور مما کو مزے لے لے کر سنا رہی تھی۔ دادی اماں اور نصیبن مما دونوں مسکرا رہی تھیں۔ راحت کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی اس لئے اس نے نایاب کو نہیں دیکھا لیکن اماں اور نصیبن نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھیں کہ نایاب نے انہیں چپ رہنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ رُک تو گئیں پھر ہنس پڑیں۔

راحت کو شک ہوا۔ اس نے پلٹ کر نایاب کو مسکراتا ہوا دروازہ پر کھڑا پایا۔ شرما کر اس نے نصیبن کی گود میں سر چھپا لیا۔ نایاب نے جب اسے اس طرح شرماتے ہوئے دیکھا تو پُر مذاق انداز میں بولے: ''اب چپ کیوں ہو گئی، ابھی تو طوطے کی طرح ٹائیں ٹائیں کر رہی تھی۔'' نصیبن نے کہا چلو اب اس کا مذاق مت اُڑاؤ، بولو کھانا نکال دوں۔ انہوں نے کہا آپ کھانا کیسے نکالیں گی ممّا، یہ بلّی جو آپ سے چمٹی ہوئی ہے۔ چھوڑے گی تب نا! سب ہنسنے لگے اور راحت موقع ملتے ہی بھاگ کھڑی

ہوئی۔

دادی پوتے سے باتیں کرنے لگیں۔ پیپر کے بارے میں پوچھا اور بھی اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ پھر اچانک پوچھ بیٹھیں، بیٹے یہ بتا کہ تجھے راحت کیسی لگتی ہے۔ نایاب گڑبڑا گئے۔ کہا، اچھی ہے، ٹھیک ہے۔ ارے بیٹے میں تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر راحت تمہاری شریکِ حیات بنے تو کیا رہے گا۔ اگر پسند ہے تو صاف صاف بتا دو ورنہ..... نایاب نے کہا، ورنہ کیا دادی اماں؟ وہ سنجیدہ ہو گئے۔

اماں نے کہا، اگر پسند ہے تو بتا دو کیونکہ تم کو تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ سب لوگوں نے تمہیں اور راحت کو پسند کر لیا ہے، اب اگر تم بھی ہاں کہہ دو تو سب کو اطمینان ہو جائے گا۔

نایاب دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے مگر یونہی کہا کہ آپ لوگوں کی مرضی ہے تو ٹھیک ہی ہے۔ اماں خوش ہو گئیں اور نایاب کی بلائیں لے کر دعائیں دینے لگیں۔ جب اماں نے نایاب کی رضامندی کی بات گھر میں سب لوگوں کو بتائیں تو سبھوں نے ایک دوسرے کو مبارکبادیاں دیں۔

راحت سے جب اس کی امی نے نایاب سے اس کے رشتہ کے بارے میں پوچھا تو وہ ایک دم شرما گئی اور بولی، مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں۔ سب خوش تھے کہ اب مناسب تاریخ طے کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ حامد بھائی کو ایک مہینہ بعد دوبئی جانا تھا، اس لئے تاریخ جلد ہی طے کر دی گئی۔ پندرہ دنوں کے بعد شادی کا دن آ گیا۔ اس درمیان ساری تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔

آج شادی کا دن تھا۔ گلستاں منزل کو بڑی خوبصورتی سے سجایا جا رہا تھا۔

صدر دروازے سے لان تک روشنی کا انتظام تھا۔ مکان کے سفید رنگ و روغن پر رنگین قمقموں کی لڑیاں اپنی بہار آپ دکھلا رہی تھیں۔ خنک ہواؤں کے دوش پر بہتی ہوئی شہنائی کی مدھم دُھنیں پُر کیف سماں پیدا کر رہی تھیں۔ شام ہونے کو تھی۔ صوفے، کرسیاں، میزیں، سب قرینے سے لگ گئے تھے۔ گھر میں بھی دریوں پر چاندنیاں، دیوانوں پر قالینیں اور زردوزی مسندیں لگائی جا چکی تھیں۔ شام ہونے کو آئی تو مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رشتہ داروں کے ساتھ گھر کے سب لوگ مہمانوں کا استقبال گرم جوشی سے کر رہے تھے۔

دولہا بنے نایاب اپنے دوستوں کی ہر بات پر مسکرا رہے تھے اور سوالوں کے جواب بھی ہنس ہنس کر دے رہے تھے۔ اِدھر راحت دُلہن کے جوڑے میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کی سہیلیاں اور رشتہ دار لڑکیاں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ سب ہنسی مذاق میں مشغول تھیں۔

نصیبن کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ بڑی بھابھی اور اماں نے ان پر اتنی ذمہ داریاں ڈال رکھی تھیں کہ انہیں دولہا دُلہن کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع بھی نہیں مل پا رہا تھا۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ نکاح کا وقت سات بجے رکھا گیا تھا۔ دُلہن تیار ہو چکی تھی۔ نصیبن نے دُلہن کے کمرے میں قدم رکھا۔ انہوں نے راحت کو گلے لگا کر دعائیں دیں، پیشانی چومی اور خوشی کے مارے ان کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ رشتہ دار عورتوں اور مہمان عورتوں کے ساتھ اماں بھی وہیں پر تھیں۔ نصیبن کی وارفتگی دیکھ کر کسی نے ان کے بارے میں اماں سے پوچھا۔ اماں نے بڑی بہو کی علالت کا ذکر کر کے کہ انہوں نے ہی نایاب کو اپنا دودھ پلا کر پالا تھا۔ جیسے ہی اماں نے اپنی بات ختم کی، نصیبن نے بڑے بھولے پن سے کہا، بی بی اماں میں تو بہت

خوش ہوں کہ دونوں کا رشتہ ہو رہا ہے، میں نے تو دونوں کو ہی دودھ پلایا ہے۔

ان کے اس انکشاف پر سب کی نگاہیں نصیبن کے چہرے پر ٹھہر گئیں اور منہ کھلے رہ گئے۔ اماں چونک گئیں اور کہا کہ نصیبن تم کیا کہہ رہی ہو؟ نصیبن نے پھر کہا، ہاں بی بی اماں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اماں نے غور سے نصیبن کو دیکھا۔ ان کے چہرے کی معصومیت صاف بتا رہی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی ہیں۔ ویسے بھی اماں کو پتہ تھا کہ نصیبن کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔ اماں کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ اُٹھالیا کہ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔ ایک زوردار طمانچہ نصیبن کے گال پر پڑنے والا تھا۔ تبھی انہوں نے یہ سوچ کر ہاتھ گرالیا کہ اس اَن پڑھ کو تو ہم نے اپنی غرض کے لئے استعمال کیا تھا۔ خدمت لیتے رہے لیکن صحیح اور غلط کی پہچان بتانے کی زحمت کسی نے نہیں اُٹھائی۔ خود تو آرام کرتے رہے اور بھری دوپہر میں دونوں بچوں کو اس کے حوالے کر دیا۔

اماں خود سے ہی شرمسار تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپکنے لگے۔

❁

# یقین

شبّو خالہ اماں کی رشتہ میں بہن لگتی تھیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، شبّو خالہ کو اپنے ہی گھر میں دیکھا تھا۔ وہ مجھ سے پانچ برس بڑی تھیں۔ ان کی اماں نہیں تھیں۔ ان کے ابو کولکاتہ میں نوکری کرتے تھے۔ وہ دو تین مہینہ پر جب گھر آتے تو شبّو خالہ کے لئے بہت ساری چیزیں لے کر آتے۔ میرے لئے بھی کپڑے اور مٹھائیاں آتیں۔

شبّو خالہ کی پڑھائی لکھائی کا خرچہ وہ اماں کو دے کر جاتے۔ اماں کے انکار کرنے پر وہ بضد ہو جاتے۔ جب ان کے ابو آتے تو شبّو خالہ دو چار دنوں کے لئے اپنے گھر چلی جاتی تھیں۔ جب نوکری پر جانے لگتے تو شبّو خالہ کو ہمارے یہاں پہنچا دیتے۔

ان کا گھر ہمارے گھر سے تھوڑی ہی دوری پر تھا۔ ہمارا گھر شہر کے بیچ میں تھا اور ان کا گھر شاہراہ کے موڑ پر ایک محلّہ میں تھا۔ ہم دونوں ساتھ ہی اسکول جاتے تھے۔ وہ بڑی نیک اور سمجھ دار تھیں۔ اسکول جانے سے پہلے وہ خود تیار ہوتیں، پھر مجھے تیار کرتیں۔ کپڑے میلے ہوتے تو اسے الگ رکھ دیتیں۔ ساتھ رہتے رہتے ہم دونوں میں بڑی اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ میرے ساتھ کھیلتیں اور پھر پڑھائی لکھائی کے بعد رات کا کھانا کھا کر ہم بستر پر چلے جاتے۔ تھوڑی دیر باتیں کرتے اور پھر سو جاتے۔

شبّو خالہ چھٹی کے دنوں میں اماں کے کام میں بھی ساتھ دیتیں۔ دھیرے دھیرے اماں کا تو کوئی کام اس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک شبّو خالہ ہاتھ نہیں لگا دیتیں۔

شبّو خالہ سادگی پسند تھیں۔ کپڑوں کے معاملے میں وہ بہت باشعور تھیں۔ ان کے کپڑے ہلکے رنگوں کے ہوتے تھے۔ جب بھی ہم کہیں جاتے، وہ سب میں خاص لگتیں۔ شبّو خالہ میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر گئی تھیں۔ ابو آئے تو وہ ان کے پاس اپنے گھر چلی گئیں۔ ادھر بڑی آپا کو دیکھنے کے لئے لڑکے والوں نے پیغام بھیج دیا تھا۔ جیسے ہی اماں کو خبر ملی، ان کے ہاتھ پیر پھولنے لگے۔ انہوں نے ابو کو شبّو خالہ کے گھر دوڑا دیا۔

مہمان دو روز کے بعد آنے والے تھے۔ دوسرے دن شبّو خالہ ابو کے ساتھ ہی آ گئیں۔ جب خالہ آ گئیں تو اماں کی جان میں جان آئی اور شبّو خالہ اماں کے ساتھ انتظامات میں لگ گئیں۔ عورتوں کے ساتھ کچھ مرد بھی آئے تھے۔ خوب خاطر ہوئی اور سب لوگوں نے بڑی آپا کو پسند کر لیا۔ بات پکی ہو جانے کے بعد تاریخ طے ہوئی اور شادی بھی ہو گئی۔ آپا سسرال سے جب واپس آئیں تو شبّو خالہ کے ابو نے سب لوگوں کو کھانے پر بلایا۔ وہاں جانے پر معلوم ہوا کہ شبّو خالہ کی بھی منسوب ہو گئی ہے۔

ابو نے سب لوگوں کو بتایا کہ میرے بھائی کا لڑکا جاوید پولس ڈیپارٹمنٹ میں ایس۔ آئی ہے۔ بھائی اور بھابھی چاہتے ہیں کہ شبّو کی شادی جاوید سے ہو جائے۔ یہ سن کر سب لوگوں نے انہیں مبارکباد دیا اور خوشی کا اظہار کیا۔ میری خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ سوچنے لگی کہ دلہن بن کر شبّو خالہ تو اور بھی خوبصورت لگیں گی۔

لڑکے کے بارے میں یا شادی کی تیاریوں کے بارے میں جو باتیں ابو اماں اور بھیا سے کرتے ہیں، سب آ کر شبّو خالہ کو بتا دیتیں۔ میری باتیں سننے کے بعد کبھی تو وہ شرما جاتیں اور کبھی اپنی اماں کو یاد کر کے رونے لگتیں۔ میں ان کے آنسو پونچھتی اور کہتی کہ مت روئیے خالہ، آپ کے ابو تو ہیں نا! وہ آپ کو کتنا چاہتے ہیں۔ پھر ہم لوگ بھی تو آپ کے اپنے ہی ہیں۔ وہ مجھے گلے سے لگا لیتیں۔

شبّو خالہ کی شادی ان کے گھر سے ہی ہونی قرار پائی تھی۔ دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔ محلّہ والوں کے علاوہ دوست اور سب رشتہ دار بھی آئے تھے۔ شادی کے بعد شبّو خالہ سسرال چلی گئیں تو میرا دل ان کے بغیر نہیں لگ رہا تھا۔ میں ان کو یاد کرتی رہتی تھی۔

ایک دن ہم لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ جھانک کر دیکھا تو شبّو خالہ جاوید صاحب کے ساتھ دروازہ پر کھڑی تھیں۔ میں نے جھٹ سے دروازہ کھولا اور شبّو خالہ سے لپٹ گئی۔ یہ دیکھ کر جاوید صاحب زیر لب مسکرانے لگے۔ تو میں شرما گئی۔ دونوں نے اماں کو سلام کیا۔ اماں نے بھی سلام کا جواب دے کر شبّو خالہ کو گلے لگا لیا۔

جب سب لوگ آرام سے بیٹھ گئے تو معلوم ہوا کہ شبّو خالہ کے ابو کی طبیعت خراب ہے۔ اسی لئے جاوید صاحب شبّو خالہ کو اپنے گھر سے چچا کے ساتھ لے کر آ گئے ہیں۔ ڈاکٹر کو دکھا کر دوا لے لی گئی ہے۔ ایک ہفتہ کے بعد جاوید صاحب اپنی پوسٹنگ پرنا گپور چلے گئے۔ شبّو خالہ نے باپ کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پھر بھی کئی مہینے بیمار رہ کر وہ رحلت کر گئے۔ شبّو خالہ نے رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا تھا۔

جاوید صاحب شبّو خالہ کو اپنے ساتھ رکھنا چاہ رہے تھے لیکن ان کا بھی

ٹھکانہ بدلتا رہتا۔ ہیڈ آفس میں بھی کم رہنا ہو رہا تھا۔ دو چار دن رہ کر جہاں ڈیوٹی ملتی، جانا پڑتا تھا۔

ابو کے گزر جانے کے بعد شبّو خالہ پر گھر کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری بھی آ گئی تھی۔ ان کا پہلے کا بنا ہوا بڑا سا مکان تھا۔ ان کی اماں کے گزر جانے کے بعد سے ہی آدھا مکان کرایہ پر تھا۔ اب شبّو خالہ کا زیادہ وقت اپنے گھر میں ہی گزرتا تھا۔ پڑوسیوں سے اچھے تعلقات ہونے کی وجہ سے وہ لوگ بھی ان کا خیال رکھتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے تین سال گزر گئے۔ اس درمیان شبّو خالہ ایک بیٹے کی ماں بھی بن گئیں۔ ان کا بیٹا بڑا پیارا تھا۔ میں جب بھی جاتی، اس کو خوب کھلاتی۔ وہ مجھے خوب پہچانتا تھا۔ شبّو خالہ اب بچے کی نگہداشت میں بھی مشغول ہو گئی تھیں۔ لیکن جب اماں بلا بھیجتیں تو آ جایا کرتی تھیں۔ اماں شبّو خالہ سے باتیں کر رہی ہوتیں اور میں جازیب ان کے بیٹے کو گود میں لئے کھلاتی رہتی۔

دو سال پہلے بھیا نے پی-او کا امتحان پاس کر لیا تھا تو ان کی نوکری مقامی بینک میں لگ گئی تھی۔ اماں ان کی شادی کرنا چاہ رہی تھیں۔ رشتے بھی آنے لگے تھے۔ لیکن مناسب رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے ٹال مٹول میں وقت گزر رہا تھا۔ پھر ایک جگہ سے رشتہ آیا، بات چلی تو سب کو رشتہ پسند آ گیا۔ اب لڑکی کو دیکھنے کی بات ہونے لگی۔

طے شدہ دن کے مطابق اماں نے شبّو خالہ کو بھی خبر کروا دیا تھا۔ لیکن شبّو خالہ نے کسی وجہ سے معذرت ظاہر کی۔ اماں بڑی آپا کے ساتھ لڑکی دیکھنے گئیں۔ لڑکی پسند آ گئی تو منگنی کی رسم بھی ادا کر دی گئی۔

دو روز کے بعد لڑکی والے بھی ہمارے یہاں آنے والے تھے۔ مہمانوں

کی خاطر مدارات کا سوال اُٹھا تو بڑی آپا نے پھر شبّو خالہ کو بلوا لینے کا مشورہ اماں کو دیا۔ بڑی آپا شروع سے ہی کام چور تھیں۔ اپنے سر درد اور بیٹی کی دیکھ بھال کا بہانہ بنالیا۔ چھوٹی آپا نے گھر کو ٹھیک ٹھاک کرنے کی ذمہ داری لے لی۔ خیر بوا کو شبّو خالہ کے یہاں بھیجا گیا۔ بوا نے شبّو خالہ کے دروازہ پر دستک دی تو ان کے کرایہ دار کی لڑکی نے دروازہ کھولا۔

بوا جب گھر میں گئیں تو شبّو خالہ کو بستر پر پڑی پایا۔ اسی لڑکی کی ماں شبّو خالہ کا سر دبا رہی تھیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کئی دنوں سے بخار آرہا ہے۔ سینہ میں درد بھی ہے۔ دوا دی گئی ہے مگر بخار ابھی اُترا نہیں ہے۔ بوا کی آواز سن کر شبّو خالہ نے آنکھیں کھول دیں۔ بوا نے پیشانی پر ہاتھ رکھا تو کافی بخار تھا۔ یہ سب دیکھ کر بوا بغیر کچھ کہے واپس آگئیں۔

انہوں نے شبّو خالہ کی بیماری کے بارے میں سب کو بتا دیا۔ میں نے سنا تو میرا دل بڑا بے چین ہوگیا۔ میں نے اماں سے کہہ دیا کہ میں شبّو خالہ کو دیکھنے جارہی ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں بوا کے ساتھ شبّو خالہ کے گھر جا پہنچی۔ خالہ کے پاس گئی، ان کا حال پوچھا تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور سسک پڑیں۔ میں نے انہیں دلاسہ دیا۔ جاوید صاحب کے ہیڈ آفس کا فون نمبر پوچھا اور بوتھ پر فون کرنے چلی گئی۔ جاوید صاحب سے تو بات نہیں ہوسکی لیکن میں نے ان کی اہلیہ کی طبیعت زیادہ خراب ہونے کی خبر دے کر انہیں فوراً بھیج دینے کی تاکید کردی۔ بوا کو یہ کہہ کر گھر بھیج دیا کہ جب جاوید صاحب آجائیں گے، تب میں آجاؤں گی۔

شبّو خالہ کو اپنے بیٹے کی بڑی فکر تھی۔ وہ بار بار اسی کا ذکر کررہی تھیں۔ دو سال کا بچہ بھلا کیا سمجھتا، وہ کرایہ دار کی بیٹی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں نے ان کی تسلی

کے لئے اسے گود میں لے لیا۔ اس کا منہ دُھلایا، کپڑے بدلے، کھانا کھلایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ میری ہی گود میں سو گیا۔

شبّو خالہ کا بخار کم ہو گیا تھا۔ پڑوسن نے ان کو بھی چائے بسکٹ کھلا دیا تھا۔ اب وہ بہت حد تک ٹھیک لگ رہی تھیں۔ جس طرح ڈاکٹر نے دوا دینے کا وقت نسخہ میں لکھا تھا، اسی حساب سے دوائیں دی جا رہی تھیں۔ ۹ بجے رات تک سب دوائیں دے دینے کے بعد میں بھی لیٹ گئی۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ شبّو خالہ کے ساتھ بیتے ہوئے دن مجھے یاد آنے لگے۔ مجھے اسکول کے لئے تیار کرنا، میرے بالوں کو سنوارنا، میرے کپڑوں پر پریس کرنا اور ساتھ کھیلنا، یہ سب مجھے یاد آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی محبت اور شفقت بھی مجھے یاد آ رہی تھی۔

ایک بار مجھے مزلس نکل آئی تھی تو شبّو خالہ میری خدمت میں جٹ گئی تھیں۔ بار بار نیم کی پتیوں سے میرے جسم کو سہلاتیں اور جھل کر ہوا دیتی تھیں۔ لوگوں کے منع کرنے پر بھی وہ دن رات میرے پاس ہی رہتیں۔ جب میں اچھی ہو گئی تو سوچتی تھی کہ اوروں کی بات وہ لوگ جانیں۔ مجھ پر جو ان کی عنایتیں اور احسانات ہیں، وہ میں کیسے چکا پاؤں گی۔ یہی سب سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی۔

صبح کے چار بجے تو خالہ کی کراہ کی آواز سن کر میری نیند ٹوٹ گئی۔ میں نے اُٹھ کر حال پوچھا تو انہوں نے سینہ میں درد کی شکایت کی۔ میں نے دوا کھلائی تو انہیں آرام مل گیا۔ صبح کے پانچ بجے جاوید صاحب بھی آ گئے۔ انہوں نے خالہ کو ایسی حالت میں دیکھا تو گھبرا گئے۔ سات بجے صبح میں ہم لوگ انہیں لے کر ہسپتال پہنچ گئے۔ جاوید صاحب نے روم بک کروا لیا تھا۔ علاج شروع ہو گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب خالہ کو کچھ آرام مل گیا تو میں نے گھر جانے کے بارے میں سوچا۔ شبّو خالہ سے

- کوشش — 124
- میرا گھر کہاں ہے — 125
- صبح کا خواب — 126
- چاندنی رات — 128
- گلاب — 130


**غـــزلیں**


- دشمنی ہو، دوستی ہو، اعتدال باقی رہے 132
- دِل پہ ہوتا ہے اثر، تو غزل ہوتی ہے 133
- کرتا ہے حسد مجھ سے کوئی، میری بلا سے 134
- میری غزل کو اپنی بتا کر چھپا دیا 135

مل کر جانا چاہ رہی تھی۔ میں روم میں گئی تو جاوید صاحب سرہانے اسٹول پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا بیٹا رونے لگا تو میں اسے گود میں لے کر پھر باہر نکل گئی۔ ابھی میں اسے بہلا ہی رہی تھی کہ جاوید صاحب نے آ کر کہا کہ نازنین، تم کو شبّو بلا رہی ہیں۔ میں ان کے قریب گئی تو انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور جاوید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں گھبرا گئی اور جاوید صاحب بھی چونک گئے۔ اماں اور بھیا بھی اسی وقت کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ شبّو خالہ نے اپنے بچہ کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی لیکن شبّو خالہ تو اس دنیا سے جا چکی تھیں۔

شبّو خالہ کے فیصلے اور ان کی موت کی وجہ سے میں بدحواسی میں ہوش کھو بیٹھی۔ کسی نے میرے منہ پر چھینٹے مارے تو دھیرے دھیرے میں ہوش میں آ گئی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ غمگیں چہرہ لئے سب لوگ میرے پاس ہی کھڑے تھے۔ جاوید صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے روتے ہوئے بیٹے کو میری گود میں ڈال دیا۔ میں چیخ چیخ کر رونا چاہ رہی تھی لیکن بچہ کی وجہ سے آنکھوں سے آنسو ہی بہتے رہے اور میں سوچتی رہی کہ شبّو خالہ نے اتنا بڑا فیصلہ چپکے سے ہی لے لیا۔ میں اس کو ان کی سمجھ داری سمجھوں یا ان کی خود غرضی مانوں یا ان کا وہ یقین جانوں جو ان کا مجھ پر تھا۔

❁

# لاڈلی

رابعہ خاتون کو تین بیٹے تھے، شکیل، کفیل اور ندیم۔ ندیم جب چھ برس کا ہوگیا تب ایک بیٹی ہوئی۔ بیٹی کے پیدا ہونے پر ماں باپ تو خوش تھے ہی، تینوں بھائی بھی بہت خوش تھے۔

ماں بیٹی کو بڑے لاڈ پیار اور محنت سے پال رہی تھی۔ وہ گھر میں سب کی دُلاری اور سب کی آنکھوں کا تارہ تھی۔ ماں باپ نے اس کا نام لاڈلی رکھا۔ جب کچھ بڑی ہوئی تو ہر ایک بات پر ضد کرنے لگی۔ رابعہ خاتون اس کی ہر ضد اور خواہش کو پوری کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتیں۔ پانچ سال کی عمر ہوتے ہوتے وہ اتنی ضدی ہوگئی کہ زمین پر گر کر اپنا ہاتھ پیر اور سر تک پٹکنے سے باز نہیں آتی۔

کریم میاں جب کپڑے کی اپنی چھوٹی سی دُکان بند کر کے رات میں گھر آتے تو بیٹی فرمائشوں کا پٹارہ کھول کر بیٹھ جاتی۔ صبح میں اس کی بتائی ہوئی ساری فرمائشی چیزیں اگر نہیں منگوائی جاتیں تو رو رو کر سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیتی۔ جب لڑکے ہوم ورک کر رہے ہوتے تب وہ خوب شرارت کرتی۔ اگر کسی نے ڈانٹ دیا تو وہ ماں کے پاس جا کر شکایت کرنے لگتی۔ ماں بھی بیٹی کی طرف داری میں بیٹوں پر برس پڑتی۔

تینوں بھائیوں کی کوشش رہتی کہ وہ کچھ پڑھ لکھ لے لیکن اس کا پڑھائی لکھائی میں بالکل جی نہیں لگتا تھا۔ گھر میں کھیلتے کھیلتے تھک جاتی تو پڑوس میں لڑکیوں

کے ساتھ کھیلنے چلی جاتی، مگر روز ہی کسی نہ کسی لڑکی سے اس کی لڑائی ہو جاتی۔ واپس آکر وہ ماں سے جھوٹی شکایت کرتی۔ پھر تو ماں طیش میں آکر پڑوسیوں کو ہی چار باتیں سنا آتی۔ محلّہ کی ایک بزرگ عورت نے رابعہ کی بکواس سن کر انہیں بیٹی کو گھر میں رکھنے کی تاکید کی اور بقیہ لڑکیوں کو بھی لاڈلی کے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیا۔

لاڈلی چونکہ تین بھائیوں کے بعد اکلوتی بیٹی تھی، اس لئے اسے اپنی اہمیت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی، ماں باپ پر اس کی فرمائشوں کا بوجھ بھی بڑھتا گیا۔ دوکان سے کریم میاں کو جو بھی منافع ہوتا، وہ تو سب گھر کے خرچ پر ہی ختم ہو جاتا۔ لڑکوں کی فیس اور کاپی کتابوں کا خرچہ پورا کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ کریم میاں پریشان ہو جاتے۔ ایسے میں بیٹی کی ہر ضد اور مہنگی فرمائشوں کو پوری کرنا ان کے لئے آسان نہیں تھا۔ وہ لاڈلی کو سمجھانا چاہتے تھے لیکن ماں کی شہ پر وہ اس قدر مغرور ہو گئی تھی کہ کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔

کریم میاں کے بڑے بیٹے شکیل میٹرک پاس کر چکے تھے۔ جب انہوں نے باپ کو پریشان دیکھا تو دو تین جگہ ٹیوشن کر لیا۔ کالج میں ایڈمیشن لے کر انہوں نے اپنی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا اور کچھ پیسے ماں کے ہاتھ پر بھی رکھنے لگے۔

بی۔کام کرنے کے بعد شکیل نے باپ کی دوکان سنبھال لی تھی۔ منجھلے بیٹے کفیل نے بی۔اے کرنے کے بعد دوا کی ایک کمپنی میں نوکری پکڑ لی اور پھر چھوٹے بیٹے ندیم نے بیتھولوجی کی ٹریننگ لے لی۔ اس طرح کریم میاں کا سارا بوجھ بیٹوں نے اپنے کندھوں پر لے لیا۔ باپ خوش تھے کہ ان کے بیٹے لائق نکلے لیکن ماں سوچ رہی تھی کہ یہ سب میری بیٹی لاڈلی کے قدمِ مبارک کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔ شکیل اور کفیل کے رشتے آنے لگے تھے۔ کریم میاں بھی اب گھر میں بہوئیں لانا چاہ رہے

تھے۔اسی لئے رابعہ اور کریم میاں نے دونوں بیٹوں کے لئے لڑکیاں چن لیں۔

دونوں بہوئیں خدمت گزار اور نیک تھیں۔لیکن لاڈلی کو ان کی کوئی بات پسند نہیں آتی۔وہ اپنی عادت کے مطابق اکثر ان کی چغلی ماں سے کھاتی۔پہلے تو بیٹی کے ورغلانے پر رابعہ نے ٹوکا ٹوکی شروع کی تھی لیکن جب اکثر باتیں غلط ثابت ہونے لگیں تو انہوں نے اس کی بات پر توجہ دینا چھوڑ دیا۔

کریم میاں کے انتقال کو کئی برس گزر گئے تھے۔شکیل کفیل سب صاحبِ اولاد ہو گئے تھے۔شکیل کو دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔کفیل کو ایک بیٹی اور تین بیٹے تھے۔سب لڑکے اور لڑکیاں اسکول میں پڑھ رہے تھے۔

شکیل نے اب کپڑے کی ایجنسی لے رکھی تھی۔وہ زیادہ تر شہر سے باہر رہتے تھے۔کفیل دوا کمپنی میں ایجنٹ تھے،اس لئے ان کا بھی گھر پر رہنا کم ہی ہوتا تھا۔رہ گئے ندیم،تو وہ کام ختم کر کے گھر آتے تو لاڈلی کو کسی نہ کسی سے اُلجھتے پاتے۔بھائیوں کی کوشش سے اس نے تھوڑا بہت پڑھ لکھ تو لیا تھا لیکن بھتیجوں پر ایسا رعب جماتی جیسے وہی سب سے زیادہ پڑھی لکھی ہے۔ندیم کو یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔وہ بہن پر برس پڑتا اور ماں کو بھی اس کو روکنے کے لئے کہتا۔اب ماں بھی اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں تو لاڈلی کو بہت ناگوار گزر رہا تھا۔وہ اپنی اہمیت کو برقرار رکھنے کی غرض سے سب کو جھوٹی بتا کر اپنی جان بچا لیتی۔

ماں کو اس کی شادی کی فکر ہونے لگی تھی لیکن اس کی خودسری اور سب پر اپنے وجود کی اہمیت کو برقرار رکھنے کی عادت کا سوچ کر وہ گھبرا بھی جاتی تھی۔لاڈلی جب اٹھارہ سال کی تھی تب ہی سے اس کے لئے لڑکے کی تلاش بھائیوں نے شروع کر دی تھی۔تین چار سال گزر گئے لیکن کوئی بھی منسوب طے نہیں ہو پائی تھی۔

پاس پڑوس کے لوگوں کو اس کی بدمزاجی اور خودسری کا اچھی طرح علم تھا۔ جب کوئی ان لوگوں سے لڑکی کے بارے میں دریافت کرتا تو لوگ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے اور پھر کوئی رشتہ کرنے کی غرض سے اس طرف آتا ہی نہیں تھا۔

بڑے بھائی نے دور کے شہر میں بڑی مشکل سے ایک رشتہ طے کیا اور جلد ہی شادی کردی گئی۔ مگر دوسری رخصتی میں جب وہ میکہ آئی تو سسرال جانے کو تیار نہیں ہوئی۔ جب ماں اور بھائیوں نے سسرال نہیں جانے کی وجہ پوچھی تو اس نے ساس اور چھوٹی نندوں کے بخئے اُدھیڑ دیئے۔ اس کا دولہا کئی بار اسے لے جانے کے لئے آیا، لیکن وہ تو ایک رٹ لگائے ہوئے تھی کہ میں الگ رہوں گی یا تم میرے میکہ میں آکر رہو اور میرے بھائیوں کے ساتھ کام کرو۔ بھلا وہ اکیلا لڑکا اپنی ماں بہنوں کو چھوڑ کر سسرال میں کیسے رہتا۔

اِدھر شوہر سے ناراض لاڈلی پہلے سے زیادہ بدمزاج اور جھگڑالو ہوگئی تھی۔ وہ ہر روز کوئی نہ کوئی بکھیڑا کھڑا کرتی رہتی۔ ندیم کی منسوب بھی ہوگئی تھی۔ ندیم کی شادی بڑے بھائی سنئے پڑھے لکھے گھرانہ میں طے کی تھی۔ ان لوگوں کے گھر کا ماحول اور رہن سہن کافی بہتر تھا۔ شادی بھی بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ سارے لڑکے لڑکیاں چچا کی شادی میں بہت خوش تھے۔ بہت سے مہمان آئے تھے۔ لاڈلی کا دولہا بھی آیا تھا۔ جب شادی کی دھوم ختم ہوگئی تو لاڈلی کے میاں نے اس کو اپنے گھر لے جانا چاہا۔ لیکن وہ ضدی لڑکی اپنی ہی بات پر اڑی رہی۔ آخیر میں وہ اسے چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا۔

شکیل اور کفیل کے بیٹے بیٹیاں اسکول کی پڑھائی ختم کر چکے تھے اور کالجوں میں داخلہ لے چکے تھے۔ سب نے اپنی پسند کے مطابق سبجیکٹ چن لئے تھے۔ اسی کے مطابق کلاسیں بھی چل رہی تھیں۔ جب کالج کا ماحول ملا تو سبھوں کے کپڑے

بھی ڈیزائنوں میں سلے جانے لگے۔ اسی بات کو لے کر ایک دن لاڈلی سے بڑی بھابھی کی کہاسنی ہوگئی۔ لاڈلی نے بڑی بھابھی سے کہا کہ اپنی لڑکیوں کو کھلے گلے والے کپڑے کیوں پہننے دیتی ہیں۔ منجھلی بھابھی نے لاڈلی کو ان سب باتوں میں دخل اندازی کرنے سے منع کیا تو اسے بہت بُرا لگا اور سب سے منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

ندیم کی سالی کا ایڈمیشن اسی شہر کے ایک کالج میں ہوگیا تھا۔ جب کسی ہوسٹل میں جگہ نہیں ملی تو ندیم کے سسر نے داماد اور سمدھن سے اسے کچھ دنوں کے لئے اپنے یہاں رکھ لینے کی درخواست کی۔ گھر کے سبھی لوگوں نے خوشی ظاہر کی اور ستارہ گھر کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ مل کر رہنے لگی۔ سب ایک ساتھ پڑھتیں لکھتیں اور ساتھ ساتھ کالج بھی جاتیں۔ پڑھائی میں ان سب کو ایک دوسرے سے مدد بھی مل رہی تھی۔ ستارہ سے سب کی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ سب آپس میں بہت خوش تھیں۔

یہ سب دیکھ کر لاڈلی جل بھن گئی۔ کہاں ستارہ پڑھی لکھی خوبصورت اور سلجھی ہوئی لڑکی اور کہاں یہ نخرے باز، جھوٹی، چغل خور اور جھگڑالو۔ اب وہ اس فراق میں رہنے لگی کہ چھوٹی بھابھی کی بہن کو گھر سے کیسے نکلوائے۔ ستارہ بہت نیک اور سلیقہ مند لڑکی تھی۔ جب بھی موقعہ ملتا، وہ بہن اور بھابھیوں کا کام میں ہاتھ ضرور بٹاتی اور سب کا خیال بھی رکھتی۔ اس لئے سب لوگ اس کو بہت چاہتے تھے۔ رابعہ اکثر اس کی مثال دے کر بیٹی کو سمجھانا چاہتیں مگر وہ تو ماں پر ہی اُلٹ کر انہیں چپ کرا دیتی۔

ایک دن جب چاروں لڑکیاں کالج چلی گئیں تو اس نے ان کی جاسوسی شروع کر دی۔ سب کی کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر اتفاق سے اس کے ہاتھ ایک کاغذ لگ گیا۔ کاغذ میں کسی لڑکی کو ایک لڑکے کی طرف سے تھوڑی بہت لگاوٹ کی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ اب تو وہ اتنا خوش ہوئی کہ یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ یہ

کاغذ کس کی کتاب سے نکلا ہے۔ وہ بڑی حفاظت سے اس پرزہ کو رکھے ہوئے تھی۔ جب شام کو سب اکٹھا ہوئے تو اس نے پرزہ سب لوگوں کو دکھا کر چھوٹی بھابھی کی بہن ستارہ کی کرتوت بیان کرنا شروع کر دیا اور بغیر رُکے اس کے غائبانہ عشق کی داستان پر اپنی مہر لگاتی چلی گئی۔ اس کی جلی کٹی باتوں کا زہر کسی کے حلق سے اُترنہیں رہا تھا۔ جب وہ الزام لگاتے لگاتے تھک گئی تو اپنی کہی ہوئی باتوں کا اثر دیکھنے کے لئے رُک گئی۔ سب لڑکے اور لڑکیاں اس کی بکواس سن کر مسکرا رہے تھے کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ کالج کے ڈرامہ میں ان میں سے ایک لڑکے اور ایک لڑکی نے حصہ لیا ہے اور اسی کی ریہرسل کو یاد کرنے کے لئے ان دونوں نے لکھ رکھا ہے۔ وہ اکثر ایک دوسرے کو سنا کر اپنی یادداشت کو پرکھ بھی رہے تھے۔ اسی طرح کی عبارت میں لکھے گئے پُرزے ان کی دوسری کاپیوں میں بھی تھے۔ جنہیں لا کر ان لوگوں نے بڑوں کے سامنے رکھ دیا۔ پہلی بار رابعہ خاتون نے لاڈلی بیٹی کو خوب ڈانٹا۔ جب ماں ڈانٹ رہی تھیں تو تینوں بھائی خاموش تھے۔ یہ دیکھ کر لاڈلی پیر پٹکتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بہت دیر تک وہ بھائیوں کا انتظار کرتی رہی۔ جب کوئی اسے منانے نہیں آیا تو وہ چپکے سے باورچی خانہ میں گئی اور کھانا کھا کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔

سب لوگوں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ اس فکر میں رہنے لگی کہ اپنا کھویا ہوا دبدبہ کیسے واپس لائے تا کہ پھر سب پر حاوی ہو جائے۔ کچھ دنوں تک وہ چپ رہی اور لوگوں کی نظروں سے بچتی رہی۔ سبھی گھر والوں نے سوچا کہ اب لاڈلی بدل گئی ہے۔ پر اس کا فتوری دماغ تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

رات میں جب سب لوگ بستر پر چلے جاتے تو وہ اکثر آہستہ سے اپنے کمرے سے نکل کر لڑکیوں کے کمرے کی طرف جاتی اور یہ سننے کی کوشش کرتی کہ

لڑکیاں اس کے بارے میں تو باتیں نہیں کر رہی ہیں۔

ایک رات کی بات ہے کہ ایک بجے اس کو لڑکیوں کے کمرے میں کسی کے آنے اور پھر واپس جانے کی چاپ سنائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھی۔ نیند بھری آنکھوں سے اس نے دو پرچھائیوں کی جھلک دیکھی۔ اس کے شاطر دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ضرور چھوٹی بھابھی کی بہن سے گھر کا ہی کوئی لڑکا ملنے آیا ہوگا۔ سب کے سامنے ستارہ بڑی بھولی بنتی ہے۔ میں اسے گھر سے نکلوا کر رہوں گی۔ اسی کمینی نے سب کو ایسا اپنی مٹھی میں لے لیا ہے کہ اب کوئی میری بات پر توجہ ہی نہیں دیتا۔ یہی سب سوچتی ہوئی وہ اپنے کمرے سے نکل کر لڑکیوں کے کمرے میں چھپ کر جھانکنے لگی۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں اس نے غور سے دیکھا تو چھوٹی بھابھی کی بہن بستر پر نہیں تھی، بقیہ تینوں بھتیجیاں سوئی ہوئی تھیں۔ وہ اتنی خوش ہوئی کہ اگر سب لوگوں کے جاگ جانے کا ڈر نہیں ہوتا تو وہ زور زور سے ٹھہا کے لگانے لگتی۔ جلدی میں گرتی پڑتی ماں کے کمرے میں گئی اور انہیں جگا دیا۔ پھر ان کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگی۔ ماں نیند میں تھی، لاڈلی کی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ ہوں ہاں کرنے لگی تو اس نے ماں کو اُٹھا کر بیٹھا دیا اور چھوٹی بھابھی کی بہن کے غائب ہونے اور کسی لڑکے کے ساتھ نکل بھاگنے کی باتیں کرنے لگی۔

رابعہ بھی اس کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گئیں۔ جب ماں کو چپ دیکھا تو اس کو غصہ آ گیا۔ وہ زور زور سے ستارہ کو بُرا بھلا کہنے لگی۔ اس کی آواز سن کر سب لوگ جاگ گئے اور سب کمروں سے باہر نکل آئے۔ وہ بولے جا رہی تھی کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ستارہ کو کسی کے ساتھ جاتے دیکھا ہے۔ آپ لوگ جا کے دیکھ لیجئے، وہ کمرے میں نہیں ہے۔ وہ بکے جا رہی تھی کہ سیڑھیوں پر سے قدموں کی آواز آنے

لگی۔ چھوٹی بھابھی اپنی بہن ستارہ کے ساتھ نیچے آرہی تھیں۔ سب لوگوں کو ایک ساتھ دیکھا تو گھبرا کر پوچھنے لگیں کہ کیا ہوا؟ بات کیا ہے؟ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا مگر رابعہ نے غصہ میں آکر لاڈلی کے گال پر ایک زوردار طمانچہ جڑ دیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ بڑے بھائی شکیل نے چھوٹے بھائی ندیم کو رات کے گیارہ بجے کی ٹرین سے کسی خاص کام کے سلسلے میں کہیں دوسرے شہر بھیجا تھا۔ چھوٹی دُلہن اوپر کے کمرے میں اکیلی تھی، اس لئے وہ بہن کو بلا کر اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ سب لوگ غیظ کی نگاہ اس پر ڈال کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

صبح ہوئی تو گھر کے سب لوگ اس سے اتنے برگشتہ تھے کہ کسی نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ایک ہفتہ وہ کھسیائی سی اپنے کمرے میں ہی رہی۔ پھر پتہ نہیں اس نے کیا سوچا کہ ماں کے پاس گئی اور اپنی غلطی کی معافی مانگنے لگی۔ پہلے تو ماں چپ رہی، پھر کہا کہ معافی ہی مانگنی ہے تو چھوٹی دُلہن اور ان کی بہن سے مانگو۔ وہ چپ چاپ اٹھی اور چھوٹی بھابھی کے پاس جا کر رونے لگی۔ چھوٹی دُلہن سمجھ گئیں کہ لاڈلی شرمندہ ہے اس لئے انہوں نے اسے گلے لگا لیا اور اسے سمجھانے لگیں کہ سنو لاڈلی! بچپن کی بات بچپنے میں گزر جاتی ہے، اب تم بڑی ہوگئی ہو اگر دوسروں کی عزت کا خیال اور سمجھ بوجھ کر نہیں چلو گی تو تم سے چھوٹے تمہاری عزت کیسے کریں گے۔ بڑے ہوں یا چھوٹے، سب کی عزت کا خیال رکھنا چاہئے۔

اِدھر رابعہ خاتون سوچ رہی تھیں کہ لاڈلی کی پرورش میں مجھ سے ہی غلطی ہوئی ہے۔ میں نے ہی اس کے دماغ میں یہ ڈال دیا تھا کہ تیسری بیٹی راج رجاتی ہے۔ یہ فرسودہ خیالات پرانے ہیں۔ ہر انسان اپنی قسمت کی ہی روٹی کھاتا ہے۔ وہ محنت کرتا ہے، تکلیفیں سہتا ہے اور اسی کا نعم البدل اس کی قسمت میں جتنا ہوتا ہے، مل

جاتا ہے یا ملتا رہتا ہے۔ لاڈلی اب بالکل نارمل تھی۔ سب لوگ بھی خوش تھے کہ ایک دن لاڈلی کا شوہر اپنی بہن کی شادی کا نوید دینے اور لاڈلی کو ساتھ لے جانے کے لئے آیا۔ اس کی اماں نے خاص طور سے سمدھن کو ایک خط لکھ کر بھیجا تھا جس میں انہوں نے اپنی بہو کو رخصت کر دینے کے لئے کہا تھا اور اپنی بیٹی کی شادی میں سب کو شریک ہونے کے لئے بھی مدعو کیا تھا۔

لاڈلی کے میاں کو تو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن اس بار جب اس کی آمد پر لاڈلی بڑی خوش نظر آئی تو وہ بھی بہت خوش تھے۔ بھابھیوں نے بھی نندوئی کی خوب خاطر مدارت کی۔ لڑکے اور لڑکیوں نے پھوپھا جان کو سنیما دکھانے کے لئے پکڑ لیا۔ لاڈلی کا دولہا بھی بیوی کے بھتیجے بھتیجیوں پر خوشی سے پیسے لٹا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر لاڈلی پھولی نہیں سما رہی تھی اور وہ دل ہی دل میں اپنی سابقہ بدعنوانیوں کا سبب تلاش کر رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس نے خود ہی ماحول کو بگاڑا تھا اس لئے خود ہی سنوارنے کی کوشش کرے گی۔

یہ بدلاؤ اس میں چھوٹی بھابھی اور رابعہ کے سمجھانے سے آیا تھا۔ اگر رابعہ لاڈلی کی ماں، اس کی پرورش صحیح طریقہ سے شروع سے ہی کرتیں تو اس کا دل و دماغ اتنا پراگندہ نہیں ہوتا۔ داماد کو رابعہ نے بھی دو روز رُک جانے کو کہا۔ ماں نے اور سب بھائی بھابھیوں نے اس کے لئے بہت سے چیزیں خریدیں۔ اس کے علاوہ سالوں نے بہنوئی کو بھی کچھ تحفے لا کر دیئے۔ جب لاڈلی جا رہی تھی تو سب کی آنکھیں پرنم تھیں لیکن دلوں میں ایک گونہ سکون بھی تھا کہ وہ خود سے سسرال جانے کو تیار ہو گئی ہے۔

❁

# 'کائنات' سے پہلے

ثریا جبیں قادری کا تعلق ہندستانی مسلمانوں کی اُس نسل سے ہے جس نے ملک کو غلام اور آزاد دونوں حالتوں میں دیکھا ہے۔ جس نسل نے مسلمانوں کے عروج کی کہانی سنی اور زوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ وہ نسل ہے جو اپنی مذہبی اور تہذیبی وراثت کی حفاظت کے لئے کوشاں اور متفکر رہی ہے۔ یہ نسل مٹتی ہوئی قدروں اور مغربی تہذیب کے غلبے سے پریشان رہی ہے جس کا اظہار وہ اپنی تقریر اور تحریر دونوں میں کرتی رہی ہے۔

ثریا جبیں قادری ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مذہبی خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں، جو مشرقی تہذیب اور مذہبی اقدار کا پاسدار رہا ہے۔ انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے گرد وپیش کی زندگی میں اخلاقی زوال پذیری، مذہبی بے اعتنائی، خودغرضی، ریاکاری اور فریب کاری جیسی منفی قدروں کو پروان چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس سے ان کا حساس دل مضطرب اور پریشان ہوجاتا ہے۔ انہوں نے گردشِ افلاک سے محلوں کے مکینوں کو جھونپڑیوں میں اور خاک نشینوں کو محلوں میں جاتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے نوکر کو آقا اور آقا کو نوکر بنتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے اپنی پیاری زبان اردو کے ساتھ ملک کی ناقدری دیکھی، انہوں نے ملک کے سینکڑوں نشیب وفراز کو کھلی آنکھوں سے دیکھا، اس کے کرب کو جھیلا، درد کو محسوس کیا اور جب درد حد سے سوا ہوگیا تو اسے کم کرنے کے لئے قلم کا سہارا لیا۔ کبھی نثر میں تو کبھی شاعری میں ان کے خیالات واحساسات الفاظ کا پیکر اختیار کرتے رہے اور پھر وہی آج ''کائنات'' کی شکل ہمارے سامنے ہے۔

'کائنات' ثریا جبیں قادری کے مشاہدات، تجربات، محسوسات اور جذبات کی

# بے ادب بدنصیب

وکیل افتخار علی ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ لاکھوں کی جائیداد کے اکیلے وارث تھے۔ ماں باپ نے ان کی شادی اپنی برادری میں ایک اچھی لڑکی سے کی تھی۔ ان کی دو بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ جب تیسرے بیٹے کی پیدائش ہوئی تو چند گھنٹوں کے بعد ان کی بیوی چل بسیں۔ گھر میں خادم اور خادماؤں کی کمی نہیں تھی لیکن گھر کی مالکن کے گزر جانے کی وجہ سے افتخار علی بے حد پریشان رہنے لگے۔ انہوں نے چھوٹے بیٹے کی دیکھ بھال کے لئے ایک آیا رکھ لی تھی لیکن بیوی کی اچانک موت نے انہیں بہت بڑا صدمہ دیا تھا۔

بڑی بیٹی بارہ برس کی تھی، باقی بچوں میں ڈھائی تین سالوں کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ ان کی پریشانیاں اور ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ کسی طرح ایک سال گزر گیا تو دوستوں نے انہیں دوسری شادی کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کی عمر پینتالیس کے آس پاس تھی۔ بچوں کا خیال کر کے وہ دوسری شادی کے حق میں نہیں تھے۔ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ کسی لڑکی کو پانچ بچوں کی ماں بنا دینا اچھی بات نہیں ہوگی۔

ایک دن ان کے قریبی دوست یعقوب وکیل نے حکیم ستار علی کی بڑی لڑکی کے بارے میں بتایا۔ انہیں کوئی لڑکا نہیں تھا۔ قلیل آمدنی میں وہ شرافت کی زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن لڑکیوں کی شادی میں دیر ہو رہی تھی۔ وہ بڑی لڑکی کی منسوب کی تلاش میں بہت پہلے سے تھے۔ مگر جو کوئی بھی لڑکی دیکھنے آتا، وہ چھوٹی لڑکیوں کو

پسند کر کے چلا جاتا۔ اب بڑی لڑکی کی شادی سے پہلے وہ چھوٹی لڑکیوں کی شادی کیسے کر دیتے۔ اسی اُلجھن میں بڑی بیٹی کی عمر تیس بتیس برس ہوگئی تھی۔

یوں تو ان کی سب لڑکیاں صوم وصلوٰۃ کی پابند اور خوبصورت تھیں، لیکن بڑی لڑکی سب سے زیادہ خوبصورت اور سلیقہ مند تھی۔ وہ امورِ خانہ داری میں بھی اتنی منظم تھی کہ گھر کی سب ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ پیسے بچا کر ماں باپ کا ہاتھ مضبوط کر رہی تھی۔

چنانچہ افتخار علی کے دوست یعقوب وکیل صاحب نے اس لڑکی کا ذکر افتخار علی سے کیا۔ انہوں نے ان پر دباؤ ڈال کر سمجھایا کہ اس طرح بغیر کسی عورت کے گھر کیسے چلے گا۔ مانا کہ تمہارے بچوں کی وہ سوتیلی ماں ہوگی، مگر ایک عورت تو گھر میں آجائے گی۔ انہوں نے حکیم ستار علی سے بات کرنے کی سوچی۔

جب یعقوب صاحب نے حکیم صاحب سے سارا ماجرا بیان کیا تو حکیم صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ایک تو اتنا بڑا گھر، اوپر سے پانچ بچوں کی ذمہ داری، میری بیٹی کا نباہ ہو سکے گا کہ نہیں۔

کچھ دیر کے بعد حکیم ستار نے سوچ کر بعد میں جواب دینے کے لئے کہا۔ جب وہ گھر آئے تو اس بات کا تذکرہ اپنی اہلیہ سے کیا۔ ایک دن بعد ان دونوں نے کافی سوچنے کے بعد بڑی بیٹی سلطانہ سے اس کی زندگی کا فیصلہ خود کرنے کی بات کی۔ افتخار علی کے گھر کے سارے نشیب وفراز سے آگاہ بھی کر دیا۔ سلطانہ نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا مگر بعد میں اس نے سوچا کہ اس کی وجہ سے والدین دوسری بہنوں سے بھی سبک دوش نہیں ہو پائیں گے۔ اس کی عمر بھی اچھی خاصی ہوگئی ہے، ایسے میں کوئی لڑکا تو ملنے سے رہا، اس لئے ماں کے دوبارہ پوچھنے پر اس نے انکار نہیں کیا۔

دو تین دنوں کے بعد یعقوب صاحب پھر حکیم صاحب کے پاس ان کا ارادہ جاننے کی غرض سے آئے۔ حکیم صاحب نے اپنی حیثیت صاف لفظوں میں بیان کردی اور پھر گھر والوں کی رضامندی سے آگاہ کردیا۔

یعقوب وکیل اتنے خوش ہوئے کہ وہیں سے اپنے دوست کو یہ خبر بتانے کے لئے چل پڑے۔ جب افتخار علی کو معلوم ہوا کہ لڑکی نے بھی اپنی رضامندی دے دی ہے تو انہیں بھی اطمینان ہوگیا۔ یعقوب صاحب نے افتخار علی سے تاریخ اور تیاری کے بارے میں مشورہ کرنا چاہا تو افتخار علی نے ساری ذمہ داری ان پر اور ان کی بیگم پر ڈال دی۔ چنانچہ یعقوب صاحب نے اپنی بیگم کے مشورے سے نکاح کا سارا انتظام کیا۔ لڑکی کے لئے زیورات، جوڑوں اور دیگر چیزوں کی خریداری مکمل کرلی گئی۔

تاریخ مقرر ہونے کے بعد افتخار علی چند دوستوں کے ساتھ بارات لے کر حکیم ستار علی کے یہاں گئے اور سلطانہ کو رخصت کرا کر اپنے گھر لے آئے۔ بچوں کو نئی ماں کا آنا ناپسند تو ہوا مگر وہ کرتے بھی کیا۔

جب پہلی ملاقات ہوئی تو افتخار علی نے اپنی دوسری بیگم سلطانہ بیگم سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں نے اپنے بچوں کی خاطر آپ سے شادی کی ہے، وہ بھی آپ کی رضامندی سے۔ آپ ایک لڑکی ہیں، میری بیگم بننے کے ساتھ ساتھ میرے بچوں کی ماں بھی بن جائیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔

میں اپنی پہلی بیگم سے بہت محبت کرتا تھا۔ آپ آگئی ہیں تو آپ کو بھی میری بیگم ہونے کا حق ضرور ملے گا۔ اب یہ گھر آپ کا ہے۔ آپ جس طرح بہتر سمجھیں، اس گھر کا انتظام اپنے ہاتھوں سے کریں۔ یہ لیجئے چابیاں۔ انہوں نے چابیوں کا گچھا

سلطانہ کے حوالے کر دیا۔

سلطانہ نے دوسرے دن سے ہی گھر کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ وہ بڑی خوش اسلوبی سے گھر کا سارا انتظام سنبھالنے لگیں۔ ان کی نفاست اور شریفانہ طور طریقہ کے افتخار علی قائل ہو گئے۔ زہرہ، سلمیٰ، اسرار، نیاز اور شہاب کا بھی وہ بڑی محبت سے خیال رکھ رہی تھیں۔ چونکہ شہاب ابھی سال بھر کا ہی تھا، اس لئے ان کا زیادہ وقت اسی کی دیکھ بھال میں گزرنے لگا۔ وہ خاوند کی پسند اور ناپسند کو بھی جان گئی تھیں۔ ان کے آرام کا پورا خیال رکھتیں۔ اس کے علاوہ ان کی ساری ضروری چیزوں کو سنبھالتیں۔ غرض یہ کہ انہوں نے خود کو اس گھر کے لئے وقف کر دیا تھا۔ افتخار صاحب ان کی مشغولیت دیکھ کر اکثر انہیں آرام کرنے کے لئے کہتے تو وہ مسکرا کر اپنی خوش دلی کا اظہار کر دیتیں۔ افتخار علی ان کی اس ادا پر ہزار جان سے قربان ہو جاتے۔

اس گھر میں جتنے نوکر نوکرانیاں تھیں، سب کے ساتھ سلطانہ بیگم کا سلوک شریفانہ اور بہتر تھا اور ان سبھوں سے سارے کام وہ بڑے حساب سے لے رہی تھیں اور ان کی ضرورتوں کو بھی مناسب طریقے سے پوری کر رہی تھیں۔

وہ لوگ بھی ان کے ہر حکم کی تعمیل بڑی خندہ پیشانی سے کرتے تھے۔ بچوں نے بھی اب انہیں ماں کا درجہ دے دیا تھا اور ممی کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے۔ یہ سب دیکھ کر افتخار علی بے حد خوش تھے اور نئی بیگم کے احسان مند بھی۔ لہٰذا وہ انہیں بے انتہا چاہنے لگے تھے۔ ہر معاملہ میں ان سے مشورہ ضرور کرتے۔ ان کی دی ہوئی رائے سو فیصدی صحیح ہوتی تو وہ ان کی ذہانت پر عش عش کر اُٹھتے۔

اسی طرح کئی سال خوشی کے گہوارے میں جھولتے گزرتے چلے گئے۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

لڑکیاں بھی اب بڑی ہوگئی تھیں۔ تینوں لڑکے تعلیم پا رہے تھے۔ چھوٹا لڑکا شہاب سلطانہ کو ہی اپنی سگی ماں سمجھتا تھا۔ سلطانہ نے بھی اسے اتنا لاڈ پیار دیا تھا کہ کبھی کبھی افتخار علی اس کے ضد اور ناز نخرے پر بگڑ جاتے پر ماں جب سمجھاتیں تو وہ ان کی ہر بات مان لیتا۔

سلطانہ نے کالج کی تعلیم پوری ہونے کے بعد لڑکیوں کو گھریلو ہنر اور امورِ خانہ داری سے بھی واقف کرا دیا تھا۔ اب ان کے رشتے آنے لگے تھے۔ پھر اچھا گھر دیکھ کر دونوں بہنوں کی شادیاں ہوگئیں۔

دونوں لڑکیاں اکثر سب سے ملنے آتی رہتی تھیں۔ سلطانہ بیٹیوں اور دامادوں کا اس طرح خیال رکھتیں جیسے ان کی سگی ماں رکھتی۔ بیٹیاں اور داماد بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

افتخار علی کے دونوں بڑے بیٹے اسرار اور نیاز تعلیم پوری کرنے کے بعد والد کے ٹمبر کا بزنس سنبھال رہے تھے۔ چھوٹے بیٹے شہاب بھی وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد کورٹ جا رہے تھے۔ ساتھ ہی جائیداد کی دیکھ بھال اور بقیہ مکانوں کا کرایہ وصول کروانے کی ذمہ داری اُٹھا رہے تھے جن میں آفس اور ادارے تھے۔

بزنس کا کام نپٹا کر دونوں بھائی کچھ دنوں بعد جب گھر آئے تو ممی کو بتایا کہ ہم دونوں نے اپنی پسند کی لڑکیاں ڈھونڈ لی ہیں۔ اسرار نے اپنے پارٹنر کی بہن کو پسند کر لیا تھا اور نیاز نے اپنے ساتھ پڑھنے والی ایک لڑکی کو پسند کر لیا تھا۔ دونوں لڑکوں نے خاندان کی عزت کو بالائے طاق رکھ کر غیر برادری میں اپنا رشتہ خود طے کر لیا تھا۔

سلطانہ نے جب سنا تو ان کے پیروں تلے کی زمین جیسے کھسک گئی۔ انہوں نے تو کچھ کہا نہیں مگر انہیں یہ خیال بار بار آ رہا تھا کہ جب وکیل صاحب سنیں گے تو

انہیں کتنا صدمہ ہوگا۔لڑکوں نے انہیں پاپا کو بتا دینے کے لئے مجبور کر دیا تا کہ وہ کہیں تو ہم لوگ نکاح کر کے یہاں لے آئیں۔

سلطانہ نے موقعہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے وکیل صاحب کے گوش گزار کر دینے کا اقرار کر لیا۔وکیل افتخار علی نے ساری باتیں بڑے تحمل سے سنیں کیونکہ بیگم نے پہلے ہی کسی بات کا اثر نہ لینے کا وعدہ لے لیا تھا۔اب ان دونوں کے پاس چارہ بھی کیا تھا۔اس لئے ان لوگوں نے اجازت دے دی۔حالانکہ ان دونوں نے چپ چاپ کورٹ میرج پہلے ہی کر لیا تھا۔

دو تین روز بعد یہ لوگ چلے گئے اور ہفتہ بعد نکاح کر کے اپنی دلہنوں کو لے کر آ گئے۔جس دن ان دونوں بھائیوں کو آنا تھا،اس دن سلطانہ نے یعقوب وکیل کی بیگم اور ان کے جونیئر کی بیگم کو بلوا لیا تھا۔جب گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی تو سلطانہ بیگم اپنی دونوں سہیلیوں کے ساتھ بیٹوں کو لینے آگے بڑھیں۔سب نوکر اور مامائیں بھی ایک طرف کھڑی تھیں۔دونوں دلہنیں معمولی گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ان دونوں نے اتنی شاندار کوٹھی اور اتنے نوکر چاکر کبھی نہیں دیکھے تھے۔

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔کوٹھی کے اندر جب ڈرائنگ روم میں انہوں نے قدم رکھا تو چور نگاہوں سے ہر چیز کو دیکھ رہی تھیں۔بہترین صوفے،خوبصورت قالینیں،دیدہ زیب جھاڑ فانوس جو یقیناً خاندانی تھے۔اس کے علاوہ پیتل کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے گلدان اور ان میں سجے ہوئے تر و تازہ گلاب کے پھول،یہ سب انہیں کسی جنت سے کم نہیں نظر آ رہے تھے۔

سلطانہ بیگم نے افتخار علی کی بڑی بیٹی زہرہ اور چھوٹی بیٹی سلمٰی کو بھابیوں کو ان کے کمروں کی طرف لے جانے کے لئے کہا۔نندیں جب انہیں ان کے کمروں

کی طرف لے جارہی تھیں تو بڑی بھابھی نے نندوں سے پوچھا کہ اتنی سجاوٹ کون کرتا ہے۔ زہرہ اور سلمٰی نے جواب دیا کہ یہ سب ہماری ممی خادماؤں کے ساتھ مل کر کرتی ہیں۔

کارڈ چھپ گیا تو ایک دن مقرر کر کے سلطانہ بیگم نے طعام ولیمہ کی رسم ادا کردی۔ دونوں بیٹوں کے ہنی مون پر جانے کے بعد بیٹیاں بھی ماں باپ سے گلے مل کر رخصت ہوگئیں۔ دونوں لڑکے پندرہ دنوں تک گھومتے رہے۔

وکیل صاحب تو دونوں بیٹوں سے ویسے بھی خفا تھے، شہاب بھی پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ اچانک ایک دن افتخار علی کی طبیعت خراب ہوگئی۔ شہاب گھر پر ہی تھے۔ انہوں نے گاڑی نکالی اور باپ کو شہر کے سب سے بڑے ہاسپٹل میں لے گئے۔ سلطانہ پریشان ہوگئیں، وہ بھی ساتھ گئیں۔ خیر، وقت پر علاج ہونے کی وجہ سے وہ سنبھل گئے لیکن ڈاکٹر نے انہیں آرام کرنے کی ہدایت دے دی کیونکہ انہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ سلطانہ نے ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وقت پر دوائیں دیتیں، کھانے میں بھی پرہیز کا خاصا خیال رکھتیں۔ ہر ہفتہ چیک اپ کرانے کے لئے خود ہی ڈاکٹر کے یہاں لے جاتیں۔ شہاب بھی باپ کے پاس گھنٹوں بیٹھے رہتے اور ان کی راحت کا خیال رکھتے۔ آہستہ آہستہ وکیل صاحب ٹھیک ہونے لگے۔

وکیل افتخار علی کے دوست یعقوب وکیل اور ان کے جونیئر روز ان سے ملنے آتے تھے۔ وہ لوگ کافی دیر تک ان کے پاس رہتے، ہر طرح کی باتیں ہوتیں۔ بہت سی گھریلو باتیں بھی افتخار علی ان سے کرتے۔ وہ سلطانہ بیگم دونوں بیٹیوں اور بیٹے شہاب سے بہت خوش تھے۔ بڑے بیٹے اسرار اور منجھلے بیٹے نیاز نے جو صدمہ

انہیں دیا تھا، وہ بھول نہیں پا رہے تھے۔ ان کے دوست انہیں تسلی تو دیتے لیکن ان کی سوچ کو بدل پانا ان دونوں کے لئے بھی مشکل ہو رہا تھا۔

بھابھیوں کی گھر سے لاپروائی، موڈرن لباس پہن کر باہر جانا، فاؤنڈیشن اور لپ اسٹک کی لیپا پوتی، یہ سب شہاب کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ ان کے چہروں کو دیکھ کر انہیں اُبکائی آنے لگتی۔ وہ رہ تو رہی تھیں سسرال میں، لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ کسی ہوٹل میں آ کر ٹھہری ہوں۔

شہاب کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتے تھے پھر بھی ایک دن انہوں نے بھائیوں سے کہا کہ آپ دونوں نے شادی تو اپنی خوشی سے کر لی لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ جس گھر میں آپ کی بیویاں رہ رہی ہیں، یہ ان کی سسرال ہے۔ ان دونوں کو گھر کی بہو کی طرح رہنا چاہئے۔ ممی کتنی پریشان ہیں۔ ان کے کام میں ہاتھ بٹانا چاہئے۔ پاپا آپ لوگوں کی وجہ سے ہی بیمار ہوئے ہیں۔

جب شہاب نے یہ سب کہا تو دونوں بھائیوں پر کچھ اثر ہوا۔ چنانچہ انہوں نے بیویوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر ان کی بیویاں تو اس گھر کی بہوئیں بن کر خود کو مہارانیاں مان چکی تھیں۔ لہٰذا ان دونوں نے شوہروں کو اتنی زور سے ڈانٹا کہ دونوں سٹپٹا کر رہ گئے۔

بیٹے ایک دن باپ کی مزاج پرسی کو گئے تو افتخار علی نے منہ پھیر کر کروٹ بدل لی۔ یہ سب دیکھ کر سلطانہ اندر ہی اندر گھلی جا رہی تھیں۔ وہ ہر وقت شوہر کی دلجوئی اور خدمت میں لگی رہتیں۔ وکیل صاحب بھی سلطانہ بیگم کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہتے۔ وہ خادموں کو ہدایت دے کر زیادہ وقت خاوند کے ساتھ ہی گزارتیں۔

ایک دن افتخار علی کی سانس اُکھڑ گئی تو وہ بچ نہیں پائے۔ گھر میں کہرام مچ

گیا۔ سلطانہ کی تو دنیا ہی اُجڑ گئی۔ انہیں اتنا صدمہ ہوا کہ بستر پکڑ لیا۔ گھر کے نوکر چاکر مالک کی موت اور پھر اتنی محبت اور شفقت لٹانے والی مالکن کی حالت دیکھ کر بے حد رنجیدہ تھے۔

شہاب اور ان کی بہنیں اپنے غم زدہ دلوں کے ساتھ ماں کا خیال رکھ رہی تھیں۔ بقیہ لوگ خانہ پُری میں مصروف تھے۔ رفتہ رفتہ سلطانہ بیگم کی حالت سدھرتی گئی تو انہوں نے بادلِ ناخواستہ سب کچھ پھر سے سنبھال لیا اور وکیل صاحب سے کیا ہوا وعدہ نبھانے کے لئے خود کو تیار کر لیا۔

چھ مہینہ کے بعد سلطانہ نے یعقوب بھائی سے شہاب کے لئے کوئی اچھے خاندان کی لڑکی ڈھونڈنے کے لئے کہا۔ کچھ دنوں بعد یعقوب بھائی اور بھابھی نے ایک لڑکی کے بارے میں بتایا۔ لڑکی کا نام فرح تھا اور وہ پڑھی لکھی ایک سلیم الطبع لڑکی تھی۔ اس کے والدین خاندانی اور شریف لوگ تھے۔

جب سلطانہ بیگم نے ہر طرح سے چھان بین کر لی تو منسوب کے بارے میں شہاب اور گھر کے لوگوں کے سامنے شہاب کے رشتہ کی بات کی اور شہاب کی مرضی جاننا چاہی۔ دونوں بیٹے اور دونوں بہوئیں تو چپ تھے لیکن شہاب نے خود ہی کہا: ممی آپ میری ماں ہیں، آپ نے جو کچھ بھی کیا، ہماری بھلائی کے لئے کیا ہے۔ آپ جہاں چاہیں جس سے چاہیں میری شادی کر دیں، میں خوشی سے قبول کر لوں گا۔ آپ کے ہاتھوں کیا گیا کوئی کام غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ شہاب کی باتیں ختم ہو گئیں تو دونوں بھائی بغلیں جھانکنے لگے۔

لڑکی پسند کرنے کے چھ ماہ بعد شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ شہاب کی شادی میں سلطانہ نے بیٹے کی شادی کے سب ارمان نکال لئے۔ انہوں نے دور اور نزدیک

ایک ایسی سچی تصویر ہے جس میں ہم ملک، ملت اور انسانیت کی حقیقی شکل دیکھ سکتے ہیں۔ مصنفہ اور شاعرہ جب کسی واقعے، مشاہدے یا تجربے سے متاثر ہوتی ہیں تو پہلے وہ اسے پوری طرح انگیز کرتی ہیں اور وہ خود کو اس کے ایک کردار کی طرح محسوس کرتی ہیں، تب جا کر وہ اپنے خیالات واحساسات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرتی ہیں۔ ان کا افسانہ 'سحر ہونے تک' اس کی بین دلیل ہے جس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی اس کہانی کا ایک کردار ہیں۔ ان کے افسانے 'قصوروار کون'، 'یقین'، 'لاڈلی' اور 'بے ادب بدنصیب' میں ہم آزادی کے بعد کے مسلم معاشرے کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی نفسیات، اس کے اطوار وعادات، اس کی ترجیحات اور اس کی مجبوریاں سمجھ سکتے ہیں۔

ثریا صاحبہ کو شعر وشاعری کا بھی بے حد شوق ہے۔ اس کتاب میں شامل ان کی دو درجن سے زائد شعری تخلیقات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کے اندر ایک شاعرانہ شخصیت مچل رہی ہے، جسے جلا دینے اور پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک دیدہ ور اور باشعور انسان کی طرح ان کی نظر زندگی کے تمام گوشوں اور شعبوں پر ہے۔ وہ انسانی، اخلاقی اور مذہبی قدروں کے زوال کے سبب کرب میں مبتلا ہیں اور ان میں بہتری واصلاح چاہتی ہیں۔ ان کی نظم 'اتحادِ ملت'، 'ایک سوال' اور 'کسک' میں ملک کی موجودہ تصویر ہے۔ شاعرہ کا دل ملک میں فرقہ پرستی، قتل وغارت گری، باہمی نفاق اور بدعنوانی جیسی لعنتوں سے مضطرب اور پریشان ہے، وہ ہر حال میں اس کی بہتری کا متمنی ہے۔ ان کی نظم 'خوش نصیبی'، 'آرزو'، 'جدائی'، 'صبح کا خواب'، 'ایک خواب' وغیرہ تخیلاتی شاعری کی مثالیں ہیں۔ انہوں نے ان میں اپنے ذاتی کرب اور درد کو بیان کیا ہے جسے ایک دردمند دل ہی سمجھ سکتا ہے۔ یہی دردمندی ان کی نظم 'غلط فہمی' اور 'سزا جھیل رہے ہیں' میں بھی جھلکتی ہے۔ ثریا جبیں کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک اولوالعزم خاتون ہیں جو حالات کے سامنے سپر ڈالنے کی بجائے پوری قوت کے

کے سارے رشتہ داروں کو اور وکیل صاحب کے دوستوں کو اہل وعیال کے ساتھ مدعو کیا۔ دونوں بیٹیوں کو اور دونوں دامادوں کو نیگ دیئے اور قیمتی جوڑے پہنائے۔ بیٹیاں بھی خوش تھیں اور دونوں داماد تو جیسے کھلے جا رہے تھے۔ وہ ساس کو سلام کرتے نہیں تھک رہے تھے۔ بہوؤں کو بھی انہوں نے مایوس نہیں کیا اور انہیں بھی ان کی پسند کے کپڑے خرید وا دیئے۔ اب باری خادموں اور خادماؤں کی تھی، اپنی جیسی پسند جس نے بتائی، ویسے ہی کپڑے خریدے گئے۔ اس کے علاوہ انہیں روپے بھی الگ سے دیئے گئے۔

بارات کے ساتھ وہ بھی اپنے گھر کی عورتوں کو لے کر سمدھیانے گئیں۔ جب بَری کے جوڑے اور زیورات کی نمائش ہونے لگی تو لوگ سلطانہ بیگم کے سلیقہ اور ان کی فراخ دلی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے۔ بقیہ سامان بھی لاجواب تھے۔ سب بہت خوش تھے اور ایسی خوشی کے ماحول میں لڑکی کی رخصتی کے وقت کچھ آنسو، کچھ سسکیاں اور کچھ یادوں کے سایے کے درمیان وہ اپنی چھوٹی بہو فرح کو شہاب کی دلہن بنا کر اپنے گھر لے آئیں۔

حجرۂ عروسی میں داخل ہونے کے بعد شہاب علی نے اپنی دلہن فرح سے کچھ ضروری باتیں کیں۔ انہوں نے کہا کہ سلطانہ بیگم جو تمہاری ساس اور ہماری ممی ہیں، ان کی بہت قدر کرنا۔ میں نے اپنی جنم دینے والی ماں کو نہیں دیکھا۔ مجھے تو اسی ماں نے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے۔ جب دس برس کی عمر کا تھا، تب کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ تمہاری سوتیلی ماں ہیں لیکن مجھے اس دن سے آج تک کوئی فرق نہیں پڑا۔ ممی سے مجھے اتنی شفقت ملی کہ میری جنم دینے والی ماں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتیں۔ مجھے ذرا سی بھی چوٹ لگتی تو ممی بے چین ہو جاتیں۔ طبیعت خراب ہوتی تو

وہ رات بھر جاگتی رہتیں۔

جب میں چھوٹا تھا تو بہت ضدی اور غصہ ور تھا۔ میری ضد اور شرارت پر پاپا مجھے ڈانٹ بھی دیتے تھے لیکن ممی پاپا کو چپ رہنے کا اشارہ کر کے مجھے بڑے پیار سے سمجھاتی تھیں۔ سوت کے بچے کو سینہ سے لگا کر پالنا اور اس کو اچھی تربیت دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن ممی نے یہ سب بڑی خوشی سے کیا۔ اس لئے تم بھی انہیں ہمیشہ میری ماں ہی ماننا اور ان کے ہر حکم کی تعمیل خوش ہو کر کرنا۔ اتنا کہہ کر شہاب علی نے سوالیہ نگاہوں سے اپنی دلہن فرح کی طرف دیکھا۔

فرح نے بڑے خلوص سے خاوند کو اطمینان دلا کر کہا کہ آپ بے فکر رہیں، میں نے خود بھی محسوس کیا ہے کہ وہ سب سے محبت کرنے والی ایک نیک اور با اصول خاتون ہیں۔ دوسری رخصتی پر جب فرح سسرال آئی تو اس نے سلطانہ کے ہر کام میں مدد کرنا شروع کر دیا۔ جب سلطانہ نے دیکھا کہ فرح خود سے ان کی مدد کرنے کو تیار ہے تو انہوں نے بھی کچھ گھریلو ذمہ داریاں اس پر ڈال دیں۔ ان دونوں کا تال میل دونوں بڑی اور منجھلی بہوؤں کو بہت ناگوار گزر رہا تھا۔

خود تو نوکروں پر حکم چلاتے نہیں تھکتیں، پر جب چھوٹی دیورانی کو کچن میں کچھ کرتے دیکھتیں تو انہیں جلن ہونے لگتی۔ ایک دن سلطانہ کو سردی ہو گئی تھی۔ فرح ان کے لئے سوپ بنانے جیسے ہی کچن میں گئی، دونوں نے طعنے مارنے شروع کر دیئے۔ شہاب ممی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے کچن سے بھابھیوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنیں تو انہوں نے معاملہ کو سمجھ لیا۔ وہ کچن میں جیسے ہی گئے، دونوں بھاگ کھڑی ہوئیں۔ شہاب اور فرح نے سوپ لا کر ممی کو پلایا اور ان کے پوچھنے پر کہ وہ دونوں کس بات پر چلا رہی تھیں، فرح نے بتا دیا۔

سلطانہ کی طبیعت اب ٹھیک ہوگئی تھی۔ فرح کے میکہ میں کوئی خاص رشتے دار باہر سے آئے تھے۔ شہاب کی ساس نے بیٹی اور داماد کو دو چار دنوں کے لئے بلا بھیجا تھا۔ سلطانہ سے اجازت لے کر شہاب فرح کو لے کر سسرال چلے گئے۔

اب دونوں بہوؤں نے اپنے شوہروں کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ انہوں نے کہا کہ مانا کہ آپ دونوں ان کے سوتیلے بیٹے ہیں اور شہاب کو انہوں نے گود میں پالا ہے، لیکن ہم بھی تو اسی گھر کی بہوئیں ہیں، ہماری وہ قدر کیوں نہیں جو فرح کی ہے۔

بڑی بہو کے ناطے ہمارے ہاتھوں میں گھر کی چابی ہونی چاہئے۔ آخر ہمارا بھی تو حق بنتا ہے۔ یہ کیا کہ چھوٹی بہو کو ممی پیسہ روپیہ حوالے کر دیں اور وہ جو جی چاہے، کرتی رہے۔ اسی طرح کی باتیں وہ صبح وشام اپنے شوہروں سے کرنے لگیں۔ شہاب کی بھی جھوٹی شکایتیں کرتیں اور اس کے خلاف بھی خوب بھڑکاتی رہتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں بھائیوں کی عقل ماری گئی اور دونوں غصہ میں سلطانہ بیگم کے پاس گئے اور گھر کی چابی بڑی بہو کو دینے کی مانگ کر بیٹھے۔ سلطانہ نے بھی چابیوں کا گچھہ ان کے حوالے کر دیا۔ دو روز کے بعد شہاب فرح کو میکہ میں چھوڑ کر گھر واپس آئے تو گھر کا سارا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ نہ وقت پر ناشتہ، نہ کھانے کا سہی انتظام۔ سب نوکروں کے رحم وکرم پر تھا۔

عادت کے مطابق دونوں بہوؤں کا نو- دس بجے تک سونا اور پھر نوکروں پر غصہ کرنا، ماماؤں کو ذلیل الفاظ سے مخاطب کرنا اور ان کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آنا، یہ سب ان دونوں کا روز کا معمول بن گیا تھا۔ جب شہاب نے اس تبدیلی کی وجہ ممی سے جاننا چاہی تو ممی نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ شہاب بیچ وتاب کھانے

لگے لیکن ممی نے انہیں خاموش رہنے کو کہہ دیا۔

اِدھر سلطانہ کی بڑی دونوں بہوؤں کی بدسلوکی اتنی بڑھ گئی کہ گھر کے سب نوکر ایک ایک کر کے سلطانہ بیگم سے معافی مانگ کر چلے گئے۔ خادمائیں بھی پر تولنے لگیں کیونکہ جب چاہ نہیں تو راہ بھی نہیں۔ اب دونوں جیٹھانی دیورانی ایک دوسرے پر الزام لگانے لگیں اور آپس میں چابی کے لئے چھینا جھپٹی شروع ہوگئی۔ عورتوں کی تکرار کی وجہ سے دونوں بھائیوں میں بھی جھگڑے ہونے لگے۔

یہ سب جھگڑے چل ہی رہے تھے کہ ایک دن یعقوب وکیل ان لوگوں کی خیریت پوچھنے آئے۔ گھر کی حالت دیکھ کر انہیں سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ سب کچھ اُلٹا پلٹا ہو رہا ہے۔ ان کے استفسار پر شہاب نے ساری باتوں سے یعقوب انکل کو آگاہ کر دیا۔

جب اسرار اور نیاز کو معلوم ہوا کہ یعقوب وکیل آئے ہیں تو انہوں نے ان سے ملاقات کرنے کی سوچی۔ انہوں نے وکیل صاحب سے کہا کہ انکل ہم جائیداد میں بٹوارہ چاہتے ہیں۔ آپ ہمارا حصہ حساب لگا کر بانٹ دیجئے۔

یہ سن کر یعقوب صاحب نے گلا صاف کیا اور کہا کہ تمہارے والد نے کہا تھا کہ جب آپس میں نا اتفاقی ہونے لگے، تب میری لکھی ہوئی وصیت سب کو تھما دینا۔ انہوں نے اپنے انتقال کے دو ماہ پہلے وصیت نامہ تیار کروالیا تھا جس کے گواہ دو اور وکیل ہیں۔ یہ سن کر دونوں بھائی خوش ہو گئے۔

وکیل صاحب نے دونوں بھائیوں کو دوسرے دن گیارہ بجے گھر پر ہی رہنے کی تاکید کر دی اور سلطانہ بیگم سے ملاقات کر کے چلے گئے۔ دوسرے دن مقررہ وقت پر اپنے دونوں جونیئر وکیل کے ساتھ آ گئے۔ وکیل یعقوب نے گھر کے سب

لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بلوالیا۔ جب سب لوگ بیٹھ گئے تب انہوں نے اپنے جونیئر کو افتخار علی صاحب کا لکھوایا ہوا وصیت نامہ پڑھ کر سب کو سنا دینے کو کہا۔ جونیئر وکیل نے وصیت نامہ پڑھنا شروع کیا۔ بڑے لڑکے اسرار اور منجھلے لڑکے نیاز کو ٹمبر کے بزنس میں برابر کی حصہ داری تھی اور اس کی آمدنی پر ان دونوں کا ہی حق تھا۔ تینوں مکان جس میں آفس اور ادارے تھے، تینوں بیٹیوں کے نام تھے۔ پانچ پانچ کٹھا شہری زمین دونوں بیٹیوں کے نام تھی۔ پانچ کٹھا زمین سلطانہ بیگم کے نام تھی اور دس کٹھا زمین شہاب کے نام تھی۔ پچیس کٹھا زمین جو افتخار علی کی شہر کے مختلف جگہوں پر تھی، اس کا بٹوارہ انہوں نے اس طرح سے کر دیا۔ اب ذکر ہوا دوسری چیزوں کا۔ بڑی کوٹھی جس میں یہ لوگ رہ رہے تھے، وہ کوٹھی اور اس کے باہر کا احاطہ، اس کے اندر اور باہر کا سارا ساز و سامان اس کے علاوہ مختلف بینکوں میں رکھا ہوا پچاس لاکھ روپیہ اور گھر میں جو بھی روپیہ پیسہ ہو، یہ سب سلطانہ بیگم کے نام تھا۔

وصیت نامہ کورٹ میں مہر بند لفافہ میں جمع تھا۔ اس کی نقل وکیلوں نے پڑھ کر سنا دیں۔ یعقوب صاحب نے ایک نفرت بھری نگاہ سے دونوں بھائیوں کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اے بدنصیبو! تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے دوست کی جان تم لوگوں کی ناخلفی اور بے ادبی کی وجہ سے گئی ہے۔ اسرار اور نیاز تم نے جو صدمہ اپنی خودسری کی وجہ سے اپنے باپ کو دیا ہے، انہوں نے تمہیں معاف نہیں کیا تھا، وہ ایک خاندانی اور بااصول آدمی تھے۔ تم دونوں کی خودغرضی اور تمہاری بیویوں کی بے راہ روی کی وجہ سے ہی انہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔

اب سنو، وصیت میں کس طرح کی ترمیم کرنے کی اجازت کسی کو نہیں۔ ہاں

یہ ضرور لکھا ہوا ہے کہ سلطانہ بیگم اپنی حیات کے بعد جس قریبی کو چاہیں، اپنی جائیداد کا وارث بنا سکتی ہیں۔ مقررہ حیات تک ان کی ملکیت ان کے پاس ہی رہے گی۔ وہ جس طرح انتظام کریں، یہ ان کو پورا حق ہے۔

یعقوب وکیل نے پھر کہا۔ تم دونوں نے اس فرشتہ صفت خاتون کی دل آزاری کی ہے جس نے سوت کے بچوں کی غلامی پر ساری زندگی نچھاور کر دی۔ تم کو یہ حق کس نے دیا کہ تم اپنی تنگ نظر بیویوں کی باتوں میں آ کر سلطانہ بیگم سے وہ کنجی چھین لو جسے ان کے خاوند نے انہیں اپنے ہاتھوں سے سونپا تھا۔ ارے بدنصیبو! شہاب کی طرح تم بھی ان کے ساتھ سلوک سے پیش آتے تو وہ خود مناسب وقت پر سب کچھ تم لوگوں میں بانٹ دیتیں۔

اب بہتر یہ ہے کہ کورٹ سے تم لوگوں کے خلاف وارنٹ نکل جائے، اس سے پہلے تم دونوں اپنی بیویوں کے ساتھ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ اتنا کہہ کر وکیل صاحب نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور باہر نکل گئے۔

# ایک سانحہ

کئی سال پہلے کی بات ہے، ایک جگہ سے شادی کا کارڈ آیا۔ شادی پٹنہ سیٹی کے ایک پرانے علاقہ میں تھی۔ جہاں شادی تھی وہ ایک بڑا سا پرانا مکان تھا۔ ایک حصّہ باہر کا الگ تھا، جس میں کچھ لوگ رہتے تھے۔ اندر ایک دو کمروں کو چھوڑ کر پورا مکان تقریباً خالی ہی رہتا تھا۔ بڑے بڑے کمرے، لمبے لمبے برآمدے، لق ودق آنگن اور دو خلوتیں تھیں۔ ایک خلوت میں دو کوٹھریاں تھیں۔

میں بارات کے دن شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے وہاں گئی تھی۔ کچھ رشتہ دار اور جان پہچان کے لوگ بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ شادی ہو جانے کے بعد جب لوگوں کو فرصت ملی تو سب لوگ لیٹ پڑ گئے۔ رات کے چار بجے میں بھی دالان میں بچھی چوکی پر لیٹ گئی۔ کچھ ہی دوری پر دو عورتیں لڑکی کے ہمراہ دینے کے لئے پوریوں کا انتظام کر رہی تھیں۔ گھی کی ضرورت پڑی تو ان میں سے ایک عورت نے مجھے چابیوں کا گچھہ دیا اور کہا کہ بی بی ذرا اسٹور میں سے گھی کا ڈبہ لے آؤ۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اسٹور کہاں ہے؟ تو انہوں نے بغل کے دروازہ کی طرف اشارہ کر دیا اور کہا کہ خلوت میں ہی تو ہے۔ میں نے چابی لے لی اور اس دروازہ میں داخل ہو گئی جو چھوٹے آنگن یعنی خلوت میں کھلتا تھا۔

اس میں دو کوٹھریاں تھیں۔ میں نے پہلی کوٹھری میں بڑا سا تالا لگا ہوا دیکھا۔ جو چابی انہوں نے بتا کر دی تھی، میں نے تالے میں ڈالی اور تالا کھل گیا۔

میں نے چابی کو تالے کے ساتھ دیوار میں بنی ایک الماری پر رکھ دیا۔ جلتے ہوئے بلب کی تیز روشنی میں ایک دوسری الماری پر میں نے گھی کا ڈبہ رکھا ہوا دیکھا۔ گھی کا ڈبہ اُٹھا کر میں نے چاہا کہ تالا بند کر دوں۔ کنجی کو تالا میں لگا کر رکھا تھا، اس لئے کہ کنجی کہیں گڑبڑ نہ جائے۔ جب میں نے تالا اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو دیکھا کہ تالا میری پہنچ سے دور بھاگ رہا ہے۔ کنجی غائب تھی اور تالہ خود بخود چل رہا تھا۔

میں حیرت زدہ کھڑی دیکھ رہی تھی کہ تالا رُک گیا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ میرا وہم ہو، اس لئے میں نے پھر تالے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سوچا کہ چابی نیچے گر گئی ہوگی۔ دوبارہ تالے کو پکڑنا چاہا تو پھر کھسکنے لگا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ یہ کوئی آسیبی خلل ہے۔ میں نے واپس ہونا چاہا تو ایسا لگا کہ کسی نے میرا پیر پکڑ لیا ہو۔ پھر چاندی کے بہت سارے سکّے جن میں پہلے زمانہ کی اٹھنّیاں اور چونّیاں بھی تھیں، گرنی شروع ہو گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے میری نظروں کے سامنے زمین پر پچاسوں سکّے جمع ہو گئے۔ یہ تماشہ دیکھ کر میں نے بڑے تحمل کے ساتھ آیت الکرسی پڑھ کر خود کو دم کیا اور ہمت جٹا کر کہا کہ آپ لوگ مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں۔ نہ تو میں یہاں کی بیٹی ہوں، نہ بہو۔ میں تو ایک مہمان ہوں۔ میرا اس گھر سے کیا واسطہ۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ کھونٹی پر ٹنگے ایک پرانے کپڑے کی جیب سے کنجی کی جھنجھناہٹ کی آواز آنے لگی۔ میں نے جیب سے چابی نکالی، تالا بند کیا اور گھی کا ڈبہ اُٹھا کر چلی آئی۔ گھی کا ڈبہ اور چابی اس عورت کے حوالے کر دیا اور چپ چاپ دوسری جگہ پر جا کر لیٹ گئی۔

جو بُرا وقت مجھ پر ابھی ابھی گزرا تھا، میں اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کسی غیبی طاقت نے مجھے اتنی ہمت دی کہ میں ڈری نہیں اور اتنی حیرت انگیز

بات کو جھیل گئی۔

میں نے اس وقت کسی سے کچھ نہیں کہا کیونکہ ویسے بھی مجھے رخصتی کے بعد گھر واپس آنا تھا۔

گھر واپس آنے کے بعد میں نے یہ بات قادری صاحب یعنی اپنے شوہر کو اور اپنے والدین کو بتائی۔ سب نے میری بات کا یقین کیا۔ سب لوگوں نے کہا کہ یقیناً آیت الکرسی نے ہی تمہاری حفاظت کی ہے۔ جس عورت نے گھی لانے کے بہانے تمہیں اسٹور روم میں بھیجا تھا، وہ ضرور اپنی بلائیں تم پر ڈالنا چاہتی ہوگی۔

دعاء کرتی ہوں کہ خدا نہ کرے، ایسے حالات کا سامنا کسی کو بھی کرنا پڑے۔

# نظمیں

ساتھ اس کا مقابلہ کرتی ہیں۔ وہ بہت کچھ کر گزرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں۔ ان کا پر اعتماد لہجہ ملاحظہ ہو ؎

تخیل میں نہاں ہے جو بھی خاکہ
حقیقت میں بدلنا چاہتی ہوں (نظم: 'کوشش')

انہوں نے 'اردو زبان'، 'موسم سرما'، 'گلاب' جیسی موضوعاتی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کے شعری حصے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری کی تمام اصناف سے واقف ہیں اور ان سب پر طبع آزمائی کر کے اپنے شعری ذوق کی تسکین کرنا چاہتی ہیں۔ 'برہا' اور 'گیت' ایسی نظمیں ہیں جس میں انہوں نے نسوانی جذبات کی کامیاب ترجمانی کی ہے۔

'کائنات' میں مصنفہ اور شاعرہ کی شخصیت پوری طرح منعکس ہوتی ہے جس میں ایک اعلیٰ اور مثبت تہذیبی و مذہبی قدروں کی امین ایک باشعور، حساس اور دردمند عورت کا چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ 'کائنات' کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اگر ثریا جبیں قادری اپنی تخلیقات پر کسی سے مشورے یا اصلاح کا سلسلہ جاری رکھتیں تو ان کا مقام ہی کچھ اور ہوتا۔

اردو کونسل ہند ثریا جبیں قادری جیسی اردو دوست اور اعلیٰ فکر و نظر کی حامل مصنفہ کی اس تصنیف کو شائع کر کے ایک منصبی فریضہ انجام دے رہی ہے۔ امید ہے کہ آپ قارئین حضرات بھی اس کی پذیرائی کریں گے۔

**اسلم جاوداں**
'دارالغیاث'، اردو گلی، سبزی باغ، پٹنہ۔۴
گشتی ہاتف: 09334050215

# خوش نصیبی

خوش نصیبی ہے ہماری آپ جو محفل میں ہیں
دُور تک ہے روشنی آپ جو محفل میں ہیں

سب یہاں موجود ہیں دیدار کرنے کے لئے
مہرباں شیریں زباں آپ جو محفل میں ہیں

منتظر ہیں سب یہاں تقریر سننے کے لئے
ہو مبارک یہ سماں آپ جو محفل میں ہیں

پھول کی خوشبو اُڑی کلیاں چمن میں کِھل گئیں
بُلبلوں کا چہچہانا، آپ جو محفل میں ہیں

الوداع کہنے سے پہلے التجا کرتے ہیں ہم
بھول نہ جائیں ہمیں، ہم آپ کی محفل میں ہیں

# آرزو

دردِ دل کس کو سنائیں آپ کے جانے کے بعد
اُلجھنیں کس کو بتائیں آپ کے جانے کے بعد

مشکلیں آسان ہوتی تو نظر آتیں نہیں
مرحلے در مرحلے ہیں آپ کے جانے کے بعد

آرزو دل میں دبا کر سوچتی ہی رہ گئی
پوری ہوتی کوئی حسرت آپ کے جانے کے بعد

کب کھلے تقدیر میری کب سفر درپیش ہو
کاش مل جاتی سعادت آپ کے جانے کے بعد

روضۂ اقدس کا نظارہ مجھے بھی ہو نصیب
ہو دعا پوری ہماری، آپ کے جانے کے بعد

❁

# اُردو زبان

مہہ لقا، اے دل رُبا، اے ریختی تجھ کو سلام
مہہ جبیں، اے دل نشیں، اے نازنیں، تجھ کو سلام

تاجروں اور صوفیوں کے ساتھ عربی فارسی
ہند ساگر طے کیا پھر سنسکرت سے مل گئی
کچھ زبانیں ہند کی جب ہوگئی تھیں ایک ساتھ
گفتگو ہونے لگی تو بن گئی اردو زباں

شاعری ہو، نثر ہو یا پھر کوئی مضمون ہو
خوبصورت اس طرح ہونے لگی اردو زباں
میرؔ نے اس کو سنوارا، خسروؔ نے پالا اسے
جام و مینا بھر لئے غالبؔ نے اس کے عشق میں

شاعری، گیتوں کی دُھن، کہکشاں چنتی ہے یہ
نکہت و رعنائیاں آہ و بُکا بُنتی ہے یہ
مسکراتی چاندنی یا چلچلاتی دھوپ ہو
آنکھ میں آنسو بھرے ہوں یا دلِ غمگین ہو

دوستوں کی دوست ہے، اہلِ وطن کی ہم نوا
دل میں بستی ہے سبھی کے، جاوداں اس کی ادا
ہند میں پیدا ہوئی سارے جہاں کی لاڈلی
پھر بھی اب تک مل نہیں پایا اسے جائز مقام
کہہ رہی ہے اب جبیںؔ، صد آفریں اردو زباں
صد آفریں اردو زباں، صد آفریں اردو زباں

# کسک

اس جہاں سے پرے، دوسرا جہاں ہوتا
خدا ہوتا، فرشتہ سا آدمی ہوتا
لگتا ہر روز دربار خدائی کا
سات پردوں کا حجاب اُٹھ جاتا
آشنا ہوتے نیازِ رَب سے
رُخِ زیبا کا نظارہ ہوتا
قدم بوسی میں ہم جھکے ہوتے
تعظیم و تکریم کا جلوہ ہوتا
قابَ قوسَین سے حضور آتے
سفارشوں کا سلسلہ ہوتا
درجہ بہ درجہ بزرگوں کی نشستیں ہوتیں
آدمی کا بھی ایک مرتبہ ہوتا
بٹتی انسان کو پسند کی سوغات
ہم کنیزوں کا بھی حصہ ہوتا

دعوتیں ہوتیں واں خوب میہمانوں کی
ہوتا پانی بھی وہاں، جامِ طہورا ہوتا
چاند تاروں کی بھی محفلیں جمتیں
کوئی خوش کلام پھر غزل سرا ہوتا
ایک طرف شبنمی جھالر ہوتی
بوند کی شکل میں پانی کا بکھرنا ہوتا
ہلکی ہلکی سی ہوائیں چلتیں ہر دم
عطر و عنبر کا مہکنا ہوتا
برف و بادل کے پہاڑوں پہ ٹہلتے ہوتے
ساتھ میں ہمدمِ خوش نوا ہوتا
قُمریاں گاتیں فضاؤں میں
ہر جگہ مختلف موسم ہوتا
بیل بوٹوں سے مُشک کی خوشبو آتی
پھول ہوتے شجر ہوتے سمندر ہوتا
زعفراں سے گھِرا ہوتا جہاں
قدرتی باڑھ کا پہرا ہوتا
ہر گھڑی موسمِ بہار کی اُلفت
گرد ہوتی، نہ غبار ہوتا، نہ صحرا ہوتا
بیچ گلزار میں جھولے ہوتے
آبشاروں میں نہانا ہوتا

ظلم ہوتا نہ شیطان کی بستی ہوتی
جھوٹ ہوتا، نہ فریب ہوتا، نہ خنجر ہوتا
نہ تھکن ہوتی، نہ آہ ہوتی، نہ اظہارِ غم
دن ہوتا، رات ہوتی اور سویرا ہوتا
روشن ہوتیں قندیلیں شبستانوں میں
نیند آتی تو قناتوں میں بسیرا ہوتا
زخم سہتے ہیں جبیں دنیا میں سجدے والے
کاش کہ کوئی مسیحا ہوتا
کانے دجّال کی اولاد بھی لاکھوں میں ہیں
مہدیؑ آتے تو نبوت کا کرشمہ ہوتا

# قلم

قدرت کا ہر کلام مکمل قلم سے ہے
دنیا کا ہر نظام مکمل قلم سے ہے

دنیا بنا کے اس نے تو سب رنگ بھر دیئے
اس کی بھی حمد و مدح اب زورِ قلم سے ہے

انساں کو دی جو عقل، نوازا ہنر سے جب
روشن ہوئے صحیفے، یہ برکت قلم سے ہے

نکلا ہے اس کی نوک سے علم و ہنر کا راز
دنیا کا سب حساب تو ہوتا قلم سے ہے

جب تک نہ تھا قلم تو یہ معدوم تھی دنیا
خاموش کائنات تھی حرکت قلم سے ہے

مانا کہ فکر بھی ہے عمل بھی شعور بھی
فاتح وہی ہوا جو زورِ قلم سے ہے

میں نے لکھی نہیں ہے جو رودادِ زندگی
اس کا سبب یہی ہے کہ دُوری قلم سے ہے

کرتا نہیں ہے جو بھی مطالعہ کتاب کا
خالی رہا وہ عقل سے، غافل قلم سے ہے

کہنے کو یوں تو کاتبِ تقدیر کی ہے بات
سچی اگر لگن ہے تو قسمت قلم سے ہے

لائے گی رنگ، فکر جبیںؔ کی ہے رہنما
دنیا کی سربلندی و عظمت قلم سے ہے

# جدائی

تم کیا گئے کہ سارے نظارے بدل گئے
محفل میں جو بھی لوگ تھے، سارے بدل گئے

لکھی تھی بڑے شوق سے زندوں پہ اِک کتاب
اوراق تو وہی ہیں، پہ عنواں بدل گئے

لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے اُس غم گسار کو
کُہرے میں وادیاں ہیں رستے بدل گئے

اب کیا کروں سنگار کہ جی چاہتا نہیں
سونی پڑی ہے مانگ، سلیقے بدل گئے

شائستہ زندگی کو نبھانے کے واسطے
خوش رنگ جو لباس تھے، سارے بدل گئے

ہر بات پہ تنقید ہے، ہر بات پہ الزام
لمحوں کی دھوپ چھاؤں میں اپنے بدل گئے

احسان سب سمیٹ لئے ہو کے بے وفا
جھوٹی ہیں سب گواہیاں، رشتے بدل گئے

یادوں کی کائنات ہے اور میں ہوں اے جبیںؔ
یوں خاکۂ حیات کے نقشے بدل گئے